دسمبر ۱۹۶۵ء

جلد ۶۴ عدد ۳

ماہنامہ

# ترجمان القرآن

مرتبہ

**سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ**

سالانہ چندہ ۷ روپے قیمت فی پرچہ ۷۵ پیسے

ترجمان القرآن، لاہور

# فہرست مضامین


| جلد ۶۴ | دسمبر ۱۹۶۵ء | عدد ۴ |
| --- | --- | --- |





| چندہ سالانہ | دفتر رسالہ ترجمان القرآن | قیمت فی پرچہ |
| --- | --- | --- |
| سات روپے | ۵-اے۔ ذیلدار پارک اچھرہ، لاہور | ۷۵ پیسے |

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ، لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# اشارات

باری تعالیٰ اپنے بندوں کو اُن کی غفلت پر مختلف طریقوں سے خبردار کرتا ہے۔ کبھی کسی گروہ کو افلاس اور بھوک کے مصائب میں مبتلا کر دیتا ہے اور پھر اُس کے طرزِ عمل سے اس بات کا جائزہ لیتا ہے کہ کون رشتۂ عبودیت میں کس حد تک ثابت قدم رہا ہے اور کس نے بندگی کے سارے تقاضوں کو پسِ پُشت ڈال کر اپنے رب سے بغاوت کا رویہ اختیار کیا ہے۔ کبھی کسی قوم کو وباؤں اور سیلابوں اور زلزلوں کی زد میں لے آتا ہے اور یہ دیکھتا ہے کہ آفات و مصائب میں گھر کر اُس کے دل میں اپنے رب کا کس قدر خوف پیدا ہوا ہے اور وہ اپنی بداعمالیوں پر کتنی نادم اور اصلاحِ حال کے لیے کتنی مضطرب اور پریشان ہے۔ اسی طرح قادرِ مطلق کبھی کسی قوم کی تنبیہ کے لیے کسی جابر اور ظالم قوم کو اُس کی دشمنی پر ابھارتا ہے اور وہ مختلف طریقوں سے اس پر عرصۂ حیات تنگ کرنا شروع کر دیتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ یہ دیکھتا ہے کہ ایمان باللہ کا دعویٰ کرنے والی قوم اپنے قول میں کتنی صادق اور اپنے دعوے میں کتنی سچی ہے اور پُرآشوب حالات میں گھر جانے کے بعد وہ اللہ پر کتنا اعتماد اور بھروسہ کرتی ہے۔

---

تادیب و انذار کے لیے اللہ کی طرف سے جو مصیبت آتی ہے اُس کی نوعیت اُس عذاب سے یکسر مختلف ہوتی ہے جو نافرمانی اور بغاوت کی مستقل روش اختیار کرنے والوں پر، پیہم تنبیہات کے بعد انہیں صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے نازل کیا جاتا ہے۔ تادیبی مصائب عارضی ہوتے ہیں، ان میں اللہ تعالیٰ کا غصہ اور غضب شامل نہیں ہوتا بلکہ ان کے پسِ پردہ اس کی رحمت و ربوبیت کارفرما ہوتی ہے، ان میں خدا کے سرکش دشمن اور بے خوف

باغی مبتلا نہیں کیے جاتے بلکہ ان کی لپیٹ میں وقتی طور پر وہی لوگ لائے جاتے ہیں جنہیں خوابِ غفلت سے جھنجھوڑنا مقصود ہو اور جن کے بارے میں اس امر کا پورا امکان موجود ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ ملنے کے بعد اپنی غلط روش کو چھوڑ کر صحیح روش اختیار کریں گے یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کی ہر قدم پر امداد کرتا ہے۔ وہ جب یہ دیکھتا ہے کہ غافل لوگ مصیبت آجانے کے بعد غفلت سے بیدار ہو کر اپنے خالق اور مالک کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں تو اس کی رحمت جوش میں آجاتی ہے۔ وہ آگے بڑھ کر خود اس کی دستگیری اور معاونت کرتا ہے۔ اگر وہ اصلاحِ حال کی معمولی کوشش بھی کرے تو ربِ رحیم اس میں بے حد و حساب خیر و برکت عطا فرما کر ان کے لیے مزید کامرانیوں کے دروازے کھول دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے جس کی اپنے بندوں سے محبت ماں باپ کی محبت سے بدرجہا زیادہ ہے، اس سے بڑھ کر خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ اُس کی مخلوق اُس راہ پر گامزن ہو جو خیر اور بھلائی کی راہ ہے اس بنا پر جب وہ گم کردہ راہ لوگوں کو ٹھوکریں کھانے کے بعد صراطِ مستقیم کی طرف پلٹتا ہوا دیکھتا ہے تو وہ خود ان کا ہاتھ تھام کر انہیں اُن کی منزلِ مقصود تک پہنچا دیتا ہے۔ رجوع الی اللہ کے احساس سے ہی رحمت خداوندی جوش میں آتی ہے اور وہ رحیم و کریم ذات راستے کی ساری منازل کو خود آسان بنا دیتی ہے۔

---

مگر اس تادیب و اِنذار کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی آزمائش سے جو ہوشمند عبرت پکڑتے ہیں اور اپنی سابقہ لغزشوں اور کوتاہیوں سے توبہ کر کے صحیح معنوں میں اس کے مطیع و فرمانبردار بندے بن کر رہنے کا عزم بالجزم کر لیتے ہیں اُن کے لیے تو یہ امتحان یقیناً خیر و برکت کا موجب ہوتا ہے، مگر وہ بدنصیب جن کی عقل پر غفلت کے پردے پڑے ہوئے ہوں، جن کے ضمیر بالکل مُردہ ہو چکے ہوں، جن کے دلوں میں ایمان کی کوئی رمق باقی نہ رہی ہو، اُن کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش اتمامِ حجت کی حیثیت

رکھتی ہے تاکہ قیامت کے روز وہ اپنے رب کے سامنے یہ عذر پیش نہ کر سکیں کہ عذاب مسلط کرنے سے پہلے انہیں بروقت متنبہ نہ کیا گیا تھا۔ اور یہ نہ کہہ سکیں کہ اگر ایسا کر دیا جاتا اور انہیں اصلاح حال کے لیے مہلت دی جاتی تو وہ یقیناً غلط روش کو ترک کر کے صحیح راہ اختیار کر لیتے۔ اس پوری حقیقت کو جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے قرآن مجید نے مختلف مقامات پر بیان فرمایا ہے۔ ہم یہاں سورۃ الانعام کی چند آیات درج کرتے ہیں۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ۔ فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۔ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ۭ حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ۔ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۔

(آیات ۴۲-۴۵)

اے نبی ہم نے تم سے پہلے بہت سی قوموں کی طرف رسول بھیجے، پھر ہم نے انہیں مصائب و آلام میں مبتلا کیا تاکہ وہ عاجزی کے ساتھ ہمارے سامنے جھک جائیں۔ پس جب ہماری طرف سے ان پر سختی آئی تو کیوں نہ انہوں نے عاجزی اختیار کی؟ مگر اُن کے دل تو اور سخت ہو گئے اور جو کچھ وہ کرتے رہے شیطان اُسے اُن کی نظر میں خوشنما بنا کر دکھاتا رہا۔ آخر کار جب وہ اُس چیز کو جس کی نصیحت انہیں کی جاتی تھی بالکل ہی فراموش کر بیٹھے تو ہم نے اُن پر ہر طرح کی خوشحالیوں کے دروازے کھول دیئے یہاں تک کہ جب وہ اُس خوشحالی پر جو انہیں ملی تھی خوب اترا گئے تو ہم نے دفعۃً انہیں پکڑ لیا اور اب حال یہ تھا کہ وہ ہر خیر سے مایوس تھے۔ اس طرح اُن لوگوں کی جڑ کاٹ کر رکھ دی گئی جنہوں نے ظلم کیا تھا۔

---

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے بڑے واضح الفاظ میں قوموں کے ساتھ اپنے طرزِ عمل کو

بیان فرمایا ہے۔ وہ جب یہ دیکھتا ہے کہ اس کے بندے اُسے بھلا کر ہلاکت اور بربادی کی راہ پر چل نکلے ہیں تو وہ انہیں مصائب و آلام میں گرفتار کر کے اس غلط روش کے انجامِ بد سے متنبہ کرتا ہے۔ لیکن اس ابتلا کا مقصد انہیں برباد کرنا نہیں ہوتا، بلکہ اصل مقصد اُن خوابِ غفلت میں گرفتار او سخت دل لوگوں کو چونکانا اور ان کے دلوں میں نرمی، انابت اور خشیت پیدا کرنا ہوتا ہے مگر یہ بدنصیب اللہ تعالیٰ کی اس تنبیہ کو قطعاً درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے اور اپنی غلط روش پر بڑے طمطراق کے ساتھ گامزن رہتے ہیں۔ فقرہ کے شروع میں لَوْلَا کا لفظ لانے سے یہ بتانا مقصود ہے کہ بجز عناد، قساوتِ قلب اور خود بینی کے اور کوئی ایسا مانع نہ تھا جو انہیں تضرّع سے باز رکھتا۔ پھر اللہ تعالیٰ ان کو ایک دوسری آزمائش میں ڈالتا ہے۔ اُن کے باغیانہ طرزِ عمل کے باوجود اُن پر فوراً عذاب نازل کر دینے کے بجائے انہیں خوشحالی سے ہمکنار کرتا ہے اور انہیں ہر قسم کے اسبابِ نعمت مہیا کرتا ہے مگر وہ نعمت کی قدر نہیں پہچانتے۔ اپنے خالق اور مالک کے شکر گزار بندے نہیں بنتے۔ اُس کے انعام و اکرام سے بھی اُن کے دل میں رجوع الی اللہ کے لیے کوئی تحریک پیدا نہیں ہوتی بلکہ اُسی معصیت اور فسق و فجور میں مبتلا رہتے ہیں جس میں پہلے مبتلا تھے۔ تب اللہ تعالیٰ اس حقیقت کو اچھی طرح ثابت کر کے کہ اُن کے اندر حق شناسی کا کوئی جوہر موجود نہیں اور اُن کا وجود انسانیت کے لیے ہر لحاظ سے مضر ہے انہیں دنیا سے مٹا دینے کا فیصلہ فرما دیتا ہے۔

---

ہم بھارت کے اس جارحانہ حملے کو قدرت کی طرف سے ایک تنبیہ سمجھتے ہیں جس کے ذریعہ ہمیں جھنجھوڑنے اور خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہم پر ایک ظالم اور جابر قوم پوری جنگی تیاریوں کے ساتھ دفعتہً پل پڑی۔ جن طاقتوں پر ہمیں بھروسہ اور اعتماد تھا انہوں نے عین وقت پر نہ صرف ہمیں دھوکا دیا بلکہ ہمارے دشمن کی کھلی اور چھپی تائید اور حمایت کی۔ ان حوصلہ شکن حالات میں جب ہم مصائب میں گرفتار تھے ہم نے اپنے مالک کو

اپنی مدد کے لیے پکارا تو اس نے ہماری ساری کوتاہیوں، لغزشوں، بدعہدیوں کو نظرانداز کر کے ہماری مدد فرمائی تاکہ ہم اُس کی قدرت کے واضح نشانات دیکھ کر عبرت حاصل کریں۔ فسق و فجور اور معصیت کی زندگی ترک کر کے نیکی اور خدا ترسی کی راہ اختیار کریں۔ خدا کے باغیوں کا سا رویہ چھوڑ کر اُس کے مطیع و فرمانبردار بندوں کا طرزِ عمل اختیار کریں۔ اور فاسق و فاجر قوموں کی تقلید کو خیرباد کہہ کر اُن لوگوں کی پیروی کرنے کا عزم کریں جو خدا کے عتاب اور غضب کے ہدف بننے کی بجائے اُس کی رحمت اور انعام و اکرام کے مستحق ٹھہرائے گئے ہیں۔

بھارت کے مقابلے میں ہماری کامرانی ہماری اپنی تدبیر کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ محض اللہ تعالیٰ کا احسان ہے جو اُس نے اس جنگ کے دوران اُس کی طرف رجوع کرنے کی وجہ سے ہم پر فرمایا ہے۔ اگر ہم نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اُس کی طرف بڑھنے کی مزید کوشش کی تو وہ ہمیں اپنی بے شمار رحمتوں اور نوازشات سے سرفراز فرمائے گا لیکن اگر ہم نے بُرا وقت ٹل جانے کے بعد اپنے آپ کو اُسی معصیت میں ملوث کرنا شروع کیا جس میں پہلے گرفتار تھے تو ہماری حالت اُس بڑھیا کی سی ہو گی جس نے قرآن مجید کے الفاظ میں نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا آپ ہی محنت سے سوت کاتا اور خود ہی اُس کا تار تار نوچ ڈالا۔ ہمارے اس طرزِ عمل سے صرف ہمارے اعمال ہی ضائع نہ ہوں گے بلکہ اس کے ذریعہ ہم اپنے اوپر اللہ کے غضب کو دعوت دیں گے اور کائنات کے سامنے یہ بات ثابت کر دیں گے کہ ہمارے دلوں میں اللہ کی بندگی کی کوئی سچی اور حقیقی تڑپ موجود نہیں، وہ بس ایک وقتی احساس تھا جس سے ہم نے طالع آزماؤں کی طرح خوب فائدہ اٹھا لیا ہے، ہم اسے مستقل طور پر اپنے سینوں میں پالنے کے قطعاً آرزومند نہیں ہیں بلکہ فاسقانہ طور طریقے ہی ہمیں زیادہ پسندیدہ اور عزیز ہیں۔

---

ہمیں اس حقیقت کو پوری طرح نگاہ میں رکھنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ جہاں بڑا رحیم و کریم ہے جہاں وہ بڑا بردبار اور حلیم ہے اور کسی فرد یا قوم کی نافرمانیوں پر فوراً گرفت نہیں کرتا، وہاں وہ

بڑا غیرت مند بھی ہے۔ وہ سنبھلنے کے لیے بار بار مہلت تو دیتا ہے لیکن جو لوگ اس مہلت سے صحیح طور پر فائدہ اٹھا کر اپنی روش میں کوئی تبدیلی پیدا کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے وہ پھر انہیں صفحۂ ہستی سے مٹانے یا دنیا میں بالکل بے اثر بنا کر ذلت و خواری کی زندگی بسر کرانے کا فیصلہ صادر فرما دیتا ہے اور اُس کا فیصلہ آجانے کے بعد نہ تو کوئی قوت اسے مؤخر کر سکتی ہے اور نہ انہیں اُس کے نتائج و عواقب سے بچا سکتی ہے۔

| | |
|---|---|
| وَلِکُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۔ فَاِذَا جَاءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ (الاعراف ۳۴) | اور ہر امت کے لیے ایک میعاد معین ہے۔ سو جب اُن کی میعاد معین آجاتی ہے تو ایک گھڑی بھر کی تاخیر و تقدیم نہیں ہوتی۔ |

---

قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کی غیرت کو برانگیختہ کرنے والی جتنی چیزوں کا ذکر کیا ہے اُن میں ایک بڑی قبیح چیز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور اُس کے دین کے ساتھ مذاق کیا جائے اس مذاق کی کئی صورتیں ہیں، مگر سب سے زیادہ شرمناک مذاق یہ ہے کہ انسان اللہ کے ساتھ عہد باندھنے اور توڑ دینے کو ایک کھیل بنالے۔ ضرورت پیش آنے پر اس کی اطاعت و فرمانبرداری کا دم بھرنے لگے اور جب ضرورت پوری ہوجائے تو اُس کی غلامی کا قلادہ گردن سے اتار پھینکے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی بندگی نہیں بلکہ اُس سے مذاق ہے، یہ دینِ حق کی پیروی نہیں بلکہ تلعّب بالدین ہے۔ قرآن مجید میں اس قسم کی ناپاک جسارت کرنے والوں کے طرزِ عمل کو اس نے اپنے بلیغانہ انداز میں یوں بیان فرمایا ہے:

| | |
|---|---|
| اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا۔ (النساء - ۱۳۷) | بے شک جو لوگ ایمان لائے پھر کافر ہو گئے۔ پھر ایمان لائے پھر کافر ہو گئے۔ پھر اپنے کفر میں بڑھتے چلے گئے تو اللہ ہرگز انہیں معاف کرنے والا نہیں ہے اور نہ کبھی انہیں راہ راست دکھانے والا ہے |

جو لوگ اللہ کے ساتھ اُس کی اطاعت و بندگی کا عہد و پیمان باندھ کر اُسے توڑتے رہتے ہیں

وہ درحقیقت نہ تو خالق کائنات کو کوئی اہمیت دیتے ہیں اور اُس کے دین کو ضروری اور سنجیدہ چیز سمجھتے ہیں۔ اُن کے نزدیک اللہ تعالیٰ بس ایک کھلونا ہے جس سے جس وقت چاہا دل بہلا لیا اور جب چاہا اس سے مُنہ موڑ لیا۔ اس طرح اُن کی نظر میں دین بھی ایک غیر سنجیدہ تفریح سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ جب فائدہ دین کا نعرہ بلند کرنے میں نظر آیا تو فوراً اس کے ساتھ اپنی وابستگی کا اعلان کرنے لگے، پھر جب اُس سے مطلوبہ فوائد حاصل ہو چکے تو اُس سے فوراً مُنہ موڑ کر کسی دوسرے دین کو اپنانے پر کمربستہ ہو گئے۔ ایسے لوگوں کے لیے اللہ کے پاس نہ مغفرت ہے نہ ہدایت۔ قرآن مجید نے دین کے ساتھ اس غیر سنجیدہ روش کو یُوں بیان فرمایا ہے:

قُلْ مَنْ يُنَجِّيكُمْ مِنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُونَهُ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً لَئِنْ أَنْجٰنَا مِنْ هٰذِهِ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشّٰكِرِينَ۔ قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيكُمْ مِنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ أَنْتُمْ تُشْرِكُونَ۔ قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰى أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِنْ فَوْقِكُمْ أَوْ مِنْ تَحْتِ أَرْجُلِكُمْ أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَيُذِيقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ۔ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُونَ۔

(الانعام ۶۳-۶۵)

ان سے پوچھو کون ہے وہ جو تمہیں صحرا اور سمندر کی تاریکیوں کے خطرات سے بچاتا ہے؟ کس سے تم مصیبت کے وقت عاجزی سے گڑگڑا کر چپکے چپکے دعائیں مانگتے ہو کہ اگر اس بلا سے تو نے ہمیں بچا لیا تو ہم ضرور شکر گزار ہوں گے۔ ان سے کہو وہ اللہ ہی تو ہے جو تمہیں اُس سے اور ہر تکلیف سے نجات دیتا ہے۔ پھر تم دوسروں کو شریک ٹھہرانے لگتے ہو۔ ان سے کہو اللہ اس پر قادر ہے کہ تم پر کوئی عذاب اوپر سے مسلط کر دے یا تمہارے قدموں کے نیچے سے برپا کر دے۔ یا تمہیں مختلف گروہوں میں بانٹ دے اور تم کو ایک دوسرے کی طاقت کا مزہ چکھوا دے۔ دیکھو، ہم کس طرح بار بار مختلف انداز میں اِن لوگوں کے سامنے اپنی نشانیاں لا رہے ہیں شاید کہ یہ حقیقت کا ادراک کرلیں

مالکِ ارض و سماوات کی غیرت تو ایک طرف رہی دنیا کے کسی آقا حتیٰ کہ کسی معمولی خادم اور ملازم کی غیرت بھی اس موقع پرستانہ روش کو گوارا نہیں کر سکتی کہ جب اُس کے تعاون اور خدمت کی ضرورت پیش آئی تو فوراً اُس کی طرف رجوع کر لیا مگر جونہی مطلب پُورا ہوا تو بے تکلف آنکھیں پھیر لیں۔ ایسی روش کو تو عام انسانی تعلقات میں بھی کبھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا اور معاشرے میں اُن لوگوں کو کبھی عزت و احترام کا مقام حاصل نہیں ہوا جو محض کسی غرض کے لیے دوسرے سے عقیدت اور محبت کا اظہار کرتے ہیں اور غرض نکل جانے کے بعد اسے پہچانتے تک نہیں۔ تعلقات میں استواری اور پائیداری انسانی سیرت کا نمایاں وصف ہے اور اسی سے کسی شخص کے خلوص کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔

جس روش کو انسان اپنے ذاتی تعلقات میں پسند نہیں کرتے بلکہ اُسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اللہ کی نظر میں وہ کیونکر پسندیدہ ہو سکتی ہے ؟ مالک الملک کی غیرت اُسے کس طرح برداشت کر سکتی ہے ؟ اللہ تعالیٰ ہمارا رب اور معبود ہے، وہ کوئی ہماری دل لگی کا سامان نہیں کہ جس طرح چاہا اُس سے سلوک کر لیا۔ نہ وہ ہمارا دست نگر ہے کہ ہم اس کی طرف توجہ کر کے اسے نہال کر دیں گے اور اس سے نظر پھیر لیں گے تو اس کی خدائی میں خلل واقع ہو جائے گا۔ ہم اپنے حفظ و بقا کے لیے بلکہ زندگی کے ایک ایک سانس کے لیے اُس ذات بے ہمتا کے ہر لحظہ محتاج ہیں۔ اُسی کی اطاعت و فرمانبرداری میں ہماری دنیوی اور اخروی فلاح کا راز مضمر ہے اس لیے جب ہم اُس سے مُنہ موڑتے ہیں تو ہم درحقیقت اس کا کچھ نہیں بگاڑتے، بلکہ خود اپنی بربادی کا سامان کرتے ہیں، اپنے آپ کو اُن ساری روحانی اور اخلاقی نعمتوں سے محروم کر لیتے ہیں جو اُس کا بندہ اور غلام بننے سے حاصل ہوتی ہیں۔

---

اس جنگ میں اللہ تعالیٰ کی ہم پر جو بے پایاں نوازشات ہوئی ہیں وہ اسی وجہ سے ہوئی ہیں کہ ہم نے اس مصیبت کے وقت مالک الملک کو پکارا اور اس کے دین کو ڈھال بنا کر

دشمن کے خلاف برسرِ پیکار ہوئے ۔ ان نوازشات سے پاکستان کا ہر فرد پوری طرح واقف ہے ۔ حتیٰ کہ جو لوگ عقیدہ و ایمان کو محض ڈھکوسلا سمجھ کر اُس کا مذاق اڑایا کرتے تھے وہ بھی اس عظیم حقیقت کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکے کہ مسلمان قوم کے لیے قوت و طاقت کا اگر کوئی منبع و مخزن ہے تو وہ صرف اسلام ہی ہے ۔ دین نے ہی ہمارے اندر یک جہتی اور اتحاد پیدا کیا ۔ شوقِ شہادت نے ، اور اس نعمت کے حاصل ہو جانے کے بعد اُخروی زندگی کی کامرانیوں کی توقع نے ہی ہماری سپاہ اور عام آبادی کے حوصلوں کو مضبوط اور بلند کیا ۔ اسی کی برکت سے ہم میں ایثار کا جذبہ پیدا ہوا اور اسی کی بدولت ہمیں تمام مسلم ممالک سے تائید حاصل ہوئی ۔

---

اس جنگ نے اس حقیقت کو پوری طرح ثابت کر دیا ہے کہ قومیت پرستی کی وہ تحریک جو مسلمان ممالک میں کئی سالوں سے بڑے زور و شور سے چلائی جا رہی ہے کوئی برگ و بار نہیں لا سکی ۔ آج بھی دنیا کے مسلمانوں کے درمیان اسلام کا رشتہ باقی سب رشتوں سے زیادہ مضبوط ہے ۔ اسلامی اخوت نے جو اثرات دنیائے اسلام پر مترتب کیے ہیں وہ اس کی مرکزیت تباہ ہونے کے صدیوں بعد بھی آج تک موجود ہیں اور انہیں غیر اسلامی قوتیں اپنا پورا زور صرف کر دینے کے بعد بھی زائل نہیں کر سکیں ۔

ایک مسلمان کا حقیقی اور بے لوث خیر خواہ ایک مسلمان ہی ہو سکتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے تعلقات کا پھر سے جائزہ لیں اور اُن طاقتوں کے ساتھ اپنی قسمت وابستہ کرنے کی بجائے جنہوں نے اپنے عہد و پیمان کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے ہمیں عین وقت پر دھوکا دیا ہے ، اُن ممالک کی طرف دوستی اور اخوت کا ہاتھ بڑھائیں جن کے بسنے والوں کے ساتھ ہم ایک مضبوط رشتے میں پہلے ہی سے منسلک ہیں اور اس بنا پر معمولی توجہ اور کوشش سے اُن کے ساتھ تعلقات کو مزید مستحکم بنایا جا سکتا ہے ۔

مغربی طاقتیں تمام مسلم ممالک کے خلاف جس قسم کی ریشہ دوانیوں میں مصروف ہیں وہ کسی صاحبِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ وہ ان ممالک کو مغربی تہذیب کے لیے ایک زبردست خطرہ سمجھتی ہیں اور اس بنا پر انہیں کمزور اور بے اثر بنا دینے کا ناپاک عزم کر چکی ہیں۔ مغرب کی بزمِ شیاطین اُس وقت تک کبھی چین سے نہیں بیٹھ سکتی جب تک اُسے اس بات کا پُوری طرح اطمینان نہ ہو جائے کہ مسلم ممالک کی حیثیت اُس کے ہاتھ میں بے جان مہروں کی سی ہو گئی ہے جنہیں وہ دنیا کی بساط پر جس طرح چاہے اپنی مرضی سے چلا سکتی ہے۔ کون سی مسلم ریاست ان طاقتوں کے شر سے محفوظ ہے؟ اس لیے تمام مسلم ممالک کو اس کے تدارک کی اجتماعی طور پر فکر کرنی چاہیے۔

اس کے لیے پہلا قدم یہ ہے کہ تمام مسلم ممالک اپنے آپ کو مغرب کی ذہنی غلامی سے نجات دلانے کی فکر کریں۔ دنیا کی کوئی اور قوم ہوتی تو اُس کے لیے یہ سوال یقیناً پریشان کُن ہوتا کہ آخر ایک نظریۂ حیات کو ترک کر کے اُس کی جگہ کونسا بہتر نظریۂ حیات لائے ——— ——— لیکن مسلمان قوم کے لیے یہ سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا۔ ہمارے پاس اسلام کی صورت میں ایک مکمل اور صحیح نظریۂ حیات موجود ہے۔ اس کی خیر و برکت سے ہم خوب واقف ہیں۔ اُس کی درخشندہ اور تابندہ روایات آج بھی ہمارے اندر موجود ہیں۔ ہم ذرا توجہ کریں تو قوت و طاقت کے اس لازوال اور اتھاہ خزانے سے بھرپور فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اسلام ہمارے اندر جتنا راسخ ہوتا چلا جائے گا اسی نسبت سے ہمارے درمیان اخوت کے رشتے مضبوط ہونگے اور پُوری دنیائے اسلام ایک جسم کی حیثیت اختیار کر لے گی جس کے کسی عضو کو معمولی تکلیف پہنچنے سے پُورا جسم تڑپ اٹھے گا۔

---

اس کے ساتھ اب وقت آ گیا ہے کہ تمام مسلم ممالک مشترکہ دفاع کے امکانات پر

بھی پوری سنجیدگی سے غور و فکر کریں ۔ کوئی ایک مسلم ملک بھی ایسا نہیں جو تنہا مغرب کی شاطرانہ چالوں اور اُس کی یلغار کا مقابلہ کر سکے اور اُس کے غلط اور ظالمانہ فیصلوں پر اثر انداز ہو کر مظلوم کی داد رسی کرانے میں کامیاب ہو سکے ۔ مغرب نے اسلامی ممالک کے خلاف جو ناپاک مہم شروع کر رکھی ہے اُس سے سب کی آزادی کو شدید خطرہ لاحق ہے ۔ ان حالات میں مسلم مدبرین کا فرض ہے کہ وہ باہم سر جوڑ کر بیٹھیں اور اس سے نبرد آزما ہونے کے لیے کوئی صحیح لائحہ عمل تیار کریں ۔ مسلمان ممالک کے پاس ذرائع کی کمی نہیں ۔ ضرورت صرف اتحاد و اتفاق اور فہم و تدبر کی ہے ۔

دنیا کی کوئی قوم اپنی آزادی کے تحفظ کے لیے غیروں کے فراہم کردہ یا ان سے خریدے ہوئے اسلحہ پر ہمیشہ کے لیے انحصار نہیں کر سکتی ۔ ہر ملک جسے اپنی آزادی عزیز ہے وہ خود اپنے ہاں حفاظت و پاسبانی کے لیے مناسب سامان فراہم کرتا ہے ۔ یہ مسئلہ صرف پاکستان کے لیے ہی خاص نہیں بلکہ تمام مسلمان ممالک اس صورت حال سے دوچار ہیں ، کیونکہ کسی مسلمان ملک میں بھی بڑے اسلحہ بنانے کا انتظام نہیں ہے ۔ اس ضرورت کی طرف انہیں فوری توجہ دینی چاہیے ۔ اگر اس وقت تمام مسلم ممالک اس معاملے میں کوئی مشترک اقدام کرنے سے قاصر ہوں تو اس کی یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ دو تین مسلم ممالک مل کر اسلحہ سازی کی صنعت کو بڑے پیمانے پر شروع کر دیں اور دوسرے مسلمان ممالک سرمایہ فراہم کرنے میں حصہ لیں ۔ اسی طرح یہ ممالک اپنے وسائل سے ٹینک ، ہوائی جہاز ، بحری جہاز اور بڑی توپیں فراہم کرنے کا بندوبست کر سکتے ہیں ۔ ہم اسلحہ کی فراہمی کے لیے جتنی جلدی غیروں سے بے نیاز ہوں گے اسی تناسب سے اپنی بہتر حفاظت کر سکیں گے ۔ اگر چین اپنی معاشی خستہ حالی کے باوجود اسلحہ کے معاملہ میں خود کفیل بن سکتا ہے تو آخر انڈونیشیا سے مراکش تک پھیلے ہوئے مسلمان ملک کیوں ایسا نہیں کر سکتے ۔

جدید اسلحہ انتہائی قیمتی ہوتا ہے ۔ اس بنا پر معاشی نقطۂ نظر سے بھی یہ کوئی عقلمندانہ

پالیسی نہیں ہے کہ ہم اپنی گاڑھے پسینے کی کمائی مغربی قوموں سے بھاری اسلحہ خریدنے پر صرف کریں اور وہ ایک طرف ہماری دولت کے بل بوتے پر قوت و طاقت حاصل کریں اور دوسری طرف ہماری مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ہماری آزادی اور حمیت کے ساتھ جس طرح چاہیں شرمناک کھیل کھیلتی رہیں۔ دنیا کی کسی باغیرت قوم کو کسی دوسری قوم کے ہاتھ کبھی مجبورِ محض بن کر نہ رہنا چاہیے۔ یہ انسانیت کی توہین ہے۔ پھر خاص طور پر ایسی اقوام کے ہاتھ میں اپنے آپ کو بے بس بنا کر دے دینا جن کی گھٹی میں مسلم دشمنی پڑی ہوئی ہو، جن کے ہاں بجز مفاد پرستی کے کوئی ضابطۂ اخلاق نہ ہو، جو فطرتاً کم ظرف سفّاک اور زیردست آزار ہوں، پرلے درجے کی حماقت ہے۔

---

تیسری چیز جس کا مسلمان ممالک کو خصوصیت کے ساتھ التزام کرنا چاہیے وہ اُن کا داخلی نظم و ضبط ہے۔ اس معاملے میں انہیں احکامِ الٰہی اور تاریخ سے پُوری طرح فائدہ اٹھانا چاہیے۔ کسی قوم کے اندر نظم و ضبط چند ضابطے وضع کرنے یا چند جابرانہ قوانین نافذ کرنے سے قائم نہیں ہو جاتا۔ یہ فکر و احساس کی داخلی تربیت کا مظہر ہے جسے صرف آزادی اور خود اعتمادی کی فضا راس آتی ہے۔ ڈر، خوف، دھونس اور دھاندلی سے اس کی بیخ کنی ہوتی ہے۔ اس بنا پر تمام مسلم ممالک کو اپنے ہاں خود اعتمادی کا ماحول پیدا کرنا چاہیے۔

مسلم قوم کے متعلق یہ غلط تاثر جو پھیلایا گیا ہے کہ اسے نکیل سے پکڑ کر ہی ترقی کی راہ پر چلایا جا سکتا ہے، مغربی استعمار کی خوفناک سازش ہے۔ اُسے چونکہ اپنے استعماری عزائم کی تکمیل کے لیے غیر ملکی اقلیت کو اکثریت پر مسلّط کرنا مقصود تھا، اس لیے اُس نے اس قوم کی صلاحیتوں اور خاص طور پر احساسِ ذمہ داری کے خلاف یہ مکروہ پروپیگنڈا شروع کیا۔ لیکن اسے تاریخ کا محض عجوبہ سمجھیے کہ جس قوم کے شعور و احساس اور اُس کی خود اعتمادی کو صدیوں تک مجروح کیا جاتا رہا، اُس کے سامنے جب کوئی فیصلہ کُن مرحلہ آیا تو اُس نے غیر معمولی تدبّر اور دانائی کا ثبوت دیا۔ آپ پاکستان پر بھارت کے اس جارحانہ حملے کو ہی دیکھیے اور پھر خود اندازہ لگائیے کہ کیا

اس قوم نے اپنے آپ کو ایثار، بلند حوصلگی، اتحاد اور تدبر میں اور اپنی رائے عام کی بیداری میں دنیا کی کسی دوسری قوم سے فروتر ثابت کیا ہے؟ جو قوم جنگ کی نازک ذمّہ داریوں سے اس خوبی کے ساتھ عہدہ برا ہو سکتی ہے وہ ہر لحاظ سے اور ہر قسم کے ماحول میں قابلِ اعتماد ہے اور اس سے اس بات کی بالکل صحیح طور پر توقع کی جا سکتی ہے کہ اگر اُسے ملک کا انتظام و انصرام چلانے اور ملک کے داخلی اور خارجی مسائل کو حل کرنے کی ذمّہ داری اُٹھانے کا موقع دیا جائے تو وہ ہر مرحلہ پر دانائی اور تدبّر کا ثبوت دے گی۔ اُس کے اندر یہ صلاحیتیں بدرجۂ اتم موجود ہیں اور اگر اُسے انہیں پروان چڑھانے کے مناسب مواقع مل جائیں تو وہ دنیا کی انتہائی ذمہ دار قوم ثابت ہو سکتی ہے۔

---

اس مقصد کے حصُول کے لیے یہ ضروری ہے کہ ملک کے اندر آزادیٔ رائے اور آزادانہ بحث مباحثہ کے لیے فضا ہموار کی جائے۔ کسی قوم میں خود اعتمادی پیدا کرنے کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ اُس کے ہر فرد کو ملک و ملّت کی بھلائی اور بُرائی کے بارے میں غور و فکر کرنے اور پھر اس کے نتائج سے دوسروں کو روشناس کرانے کا پُورا اختیار ہو۔ اس جنگ نے اس بات کو پُوری طرح ثابت کر دیا ہے کہ قوم کے مختلف عناصر میں کوئی عنصر بھی ملک کا بدخواہ نہیں بلکہ ہر ایک انتہائی خیر خواہ اور وفادار ہے۔ اور ان میں سے ہر ایک اس کی سلامتی کو اپنی جان کی سلامتی سے بھی عزیز تر سمجھتا ہے۔ جہاں تک ملک کے تحفظ کا تعلق ہے سب ایک دوسرے کے ساتھ متحد اور متفق ہیں۔ یہ بدیہی حقیقت اس ملک کے سارے طبقوں کی نگاہ میں رہنی چاہیے اور اس بنا پر اگر وہ کسی طبقے کی رائے یا خیال کو اپنے اندازِ فکر سے قدرے مختلف پاتے ہوں تو انہیں موردِ الزام ٹھہرانے کی بجائے اُن کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر ہمارے نزدیک کسی کی رائے غلط ہے تو اس کا مُنہ بند کرنے کے بجائے ہمیں دلائل سے اس کی غلطی اس پر واضح کرنی چاہیے۔ آزاد فضا ہی میں مختلف نقطہ ہائے نظر اُبھر کر سامنے آسکتے ہیں، اسی فضا میں غلطیوں کی بروقت نشاندہی اور ان کی اصلاح ہوتی ہے، اور اسی فضا میں مختلف نقطہائے نظر کی صحت اور سقم کے متعلق پوری قوم غور و

فکر کر کے کسی صحیح نتیجہ پر پہنچ سکتی ہے ۔ یہ طرزِ فکر بنیادی طور پر غلط ہے کہ پوری قوم ایک ہی انداز پر سوچے یا صرف چند آدمی غور و فکر کریں اور باقی قوم بھیڑوں کی طرح آنکھیں بند کر کے اُن کے پیچھے چلتی رہے ۔ ہمیں پوری قوم کو سوچنے اور غور و فکر کرنے اور صحیح فیصلہ پر پہنچنے کی تربیت دینی چاہیے ۔ اس طرح اُس میں خود اعتمادی پیدا ہو گی، احساسِ ذمہ داری نشوونما پائے گا اور وہ کسی خارجی دباؤ کے بغیر بڑی خوشدلی کے ساتھ اُن ذمہ داریوں سے از خود عہدہ برآ ہونے کی کوشش کریگی جو ایک آزاد قوم کی حیثیت سے اس پر عائد ہوتی ہیں ۔ اس سے ملک کے مختلف طبقوں کے درمیان بُعد و بیگانگی دُور ہو گی ۔ ہر فرد اپنے آپ کو ملکی معاملات میں براہِ راست شریک تصور کرے گا، اور کسی دوسرے پر احسان جتانے کے لیے نہیں بلکہ فرض کی ادائیگی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے بیتاب ہو گا ۔

---

اسی ضمن میں ہم مسلم ممالک کے سربراہوں کی خدمت میں یہ بات بھی عرض کرنا انتہائی ضروری سمجھتے ہیں کہ انہیں غیر ملکی امداد اور قرضوں پر نمائشی ترقی کے جلوے دکھانے کی پالیسی کو اب بالکل خیرباد کہہ دینا چاہیے اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو وسائل دیئے ہیں اُن سے پورا پورا فائدہ اٹھا کر خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی فکر کرنی چاہیے ۔ غیر ملکی امداد اور قرضے اپنے ساتھ غیر ملکی سکے اور مشینری ہی نہیں لاتے بلکہ اپنے جلو میں بیرونی دباؤ اور عیّار ماہرین کی ایک زبردست فوج اور مغربی تہذیب و تمدن کے مفاسد بھی لاتے ہیں ۔ جن لوگوں کو ان قرضوں کے نگران کی حیثیت سے مختلف ممالک میں بھیجا جاتا ہے وہ معاشی میدان میں کوئی قابلِ قدر رہنمائی دے سکیں یا نہ دے سکیں مگر سیاسی چالیں چلنے میں بڑی مہارت اور چابکدستی کا ثبوت دیتے ہیں اور ملک کے اندر اپنے اثر و نفوذ کو ہر جائز و ناجائز طریق سے بڑھانے کے درپے رہتے ہیں ۔ اُن کی ریشہ دوانیوں سے ملکی استحکام کو شدید صدمہ پہنچتا ہے اور اُن کی دخل اندازی کی وجہ سے ملک کی خارجی اور داخلی پالیسی بسا اوقات ایک ایسا نہج اختیار کر لیتی ہے جو اُن کے استعماری

عوام کے لیے تو مفید اور کار آمد ہوتا ہے مگر قوم کی آرزوؤں اور اُمنگوں کا کسی لحاظ سے بھی شارح اور ترجمان نہیں ہوتا۔

یہ اثر و نفوذ صرف سیاسی اور معاشی دوائر تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ تمدن و معاشرت کے لیے بھی انتہائی تباہ کن ثابت ہوتا ہے۔ اس سے ہمارے عوام کا مزاج بگڑتا ہے، اُن کے اخلاق کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچتا ہے اور ہمارے اندر سے ایک ایسا طبقہ اُبھر کر سامنے آتا ہے جو رنگ و نسل کے اعتبار سے گو ہمارے قریب ہو مگر فکر و احساس کے اعتبار سے ہم سے یکسر بیگانہ ہوتا ہے۔ غیر ملکی طاقتیں اپنے اثر و رسوخ کو کام میں لا کر اس طبقے کے تسلّط کو زندگی کے ہر میدان میں بڑھانے کی کوشش کرتی ہیں اور پھر اس سے مغربی اقدارِ حیات کی نشر و اشاعت کا کام لیتی ہیں۔ یہ سارا کام اتنی صفائی کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی اور دیکھتے دیکھتے پورے ملک پر مغربی تہذیب کی آکاس بیل پھیل جاتی ہے۔ ہم جتنی جلدی ان قرضوں سے چھٹکارا حاصل کریں اتنا ہی یہ ہماری معیشت، معاشرت، سیاسی استحکام اور قومی خودداری اور خود اعتمادی کے لیے مفید ہو گا۔

# تفہیم القرآن

## محمدؐ

(۲)

یہ ہے تمہارے کرنے کا کام۔ اللہ چاہتا تو خود ہی اُن سے نمٹ لیتا، مگر یہ راستہ اس نے اس لیے اختیار کیا ہے کہ تم لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ سے آزمائے۔[۹] اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں گے اللہ ان کے اعمال کو ہرگز ضائع نہ کرے گا۔[۱۰] وہ ان کی رہنمائی فرمائے گا، ان کا حال درست کر دے گا، اور ان کو اس جنت میں داخل کرے گا جس سے وہ ان کو واقف کرا چکا ہے۔[۱۱]

---

۹ یعنی اللہ تعالیٰ کو اگر محض باطل پرستوں کی سرکوبی ہی کرنی ہوتی تو وہ اس کام کے لیے تمہارا محتاج نہ تھا۔ یہ کام تو اس کا ایک زلزلہ یا ایک طوفان چشم زدن میں کر سکتا تھا۔ مگر اس کے پیش نظر تو یہ ہے کہ انسانوں میں سے جو حق پرست ہوں وہ باطل پرستوں سے ٹکرائیں اور ان کے مقابلہ میں مجاہدہ کریں، تاکہ جس کے اندر جو کچھ اوصاف ہیں وہ اس امتحان سے نکھر کر پوری طرح نمایاں ہو جائیں اور ہر ایک اپنے کردار کے لحاظ سے جس مقام اور مرتبے کا مستحق ہو وہ اس کو دیا جائے۔

۱۰ مطلب یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں کسی کے مارے جانے کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ آدمی اپنی جان سے گیا اور اس کی ذات کی حد تک اُس کا کیا کرایا سب ملیامیٹ ہو گیا۔ اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ شہداء کی قربانیاں خود اُن کے لیے نہیں بلکہ صرف انہی لوگوں کے لیے نافع ہیں جو اُن کے بعد اس دنیا میں زندہ رہیں اور اُن کی قربانیوں سے یہاں متمتع ہوں، تو وہ غلط سمجھتا ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ خود شہید ہونے والوں کے لیے بھی یہ زیاں کا نہیں بلکہ نفع کا سودا ہے۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا[۱۲] اور تمہارے قدم مضبوط جما دے گا۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے، تو اُن کے لیے ہلاکت ہے[۱۳] اور اللہ نے ان کے اعمال کو بھٹکا دیا ہے۔ کیونکہ انہوں نے اُس چیز کو ناپسند کیا جسے اللہ نے نازل کیا ہے[۱۴]، لہٰذا اللہ نے اُن کے اعمال ضائع کر دیئے۔ کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہ تھے کہ اُن لوگوں کا انجام دیکھتے جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں؟ اللہ نے اُن کا سب کچھ اُن پر اُلٹ دیا، اور ایسے ہی نتائج اِن کافروں کے لیے مقدر ہیں[۱۵]۔ یہ

---

[۱۱] یہ ہے وہ نفع جو راہِ خدا میں جان دینے والوں کو حاصل ہو گا۔ اس کے تین مراتب بیان فرمائے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ اُن کی رہنمائی فرمائے گا۔ دوسرے یہ کہ ان کا حال درست کر دے گا۔ تیسرے یہ کہ ان کو اس جنت میں داخل کرے گا جس سے وہ پہلے ہی ان کو واقف کرا چکا ہے۔ رہنمائی کرنے سے مراد ظاہر ہے کہ اس مقام پر جنت کی طرف رہنمائی کرنا ہے۔ حالت درست کرنے سے مراد یہ ہے کہ جنت میں داخل ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ ان کو خلعتوں سے آراستہ کر کے وہاں لے جائے گا اور ہر اُس آلائش کو دُور کر دے گا جو دنیا کی زندگی میں اُن کو لگ گئی تھی۔ اور تیسرے مرتبے کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں پہلے ہی ان کو قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بتایا جا چکا ہے کہ وہ جنت کیسی ہے جو اللہ نے ان کے لیے مہیا کر رکھی ہے۔ اُس جنت میں جب وہ پہنچیں گے تو بالکل اپنی جانی پہچانی چیز میں داخل ہوں گے اور ان کو معلوم ہو جائے گا کہ جس چیز کے دینے کا اُن سے وعدہ کیا گیا تھا وہی اُن کو دی گئی ہے، اُس میں یک سرِ مُو فرق نہیں ہے۔

[۱۲] اللہ کی مدد کرنے کا ایک سیدھا سادھا مفہوم تو یہ ہے کہ اس کا کلمہ بلند کرنے کے لیے جان و مال سے جہاد کیا جائے۔ لیکن اس کا ایک غامض مفہوم بھی ہے جس کی ہم اس سے پہلے تشریح کر چکے ہیں (ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اول، ص ۲۵۶)

[۱۳] اصل الفاظ ہیں فَتَعْسًا لَّهُمْ۔ تعس ٹھوکر کھا کر منہ کے بل گرنے کو کہتے ہیں۔

[۱۴] یعنی انہوں نے اپنی پرانی جاہلیت کے اوہام و تخیلات اور رسم و رواج اور اخلاقی بگاڑ کو ترجیح

اس لیے کہ ایمان لانے والوں کا حامی و ناصر اللہ ہے اور کافروں کا حامی و ناصر کوئی نہیں[16] ع

ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو اللہ اُن جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، اور کفر کرنے والے بس دنیا کی چند روزہ زندگی کے مزے لوٹ رہے ہیں، جانوروں کی طرح کھا پی رہے ہیں[17]، اور اُن کا آخری ٹھکانا جہنّم ہے۔

اے نبی، کتنی ہی بستیاں ایسی گزر چکی ہیں جو تمہاری اُس بستی سے بہت زیادہ زور آور تھیں جس نے تمہیں نکال دیا ہے۔ انہیں ہم نے اس طرح ہلاک کر دیا کہ کوئی ان کا بچانے والا نہ تھا[18]۔ بھلا کہیں ایسا ہو سکتا ہے کہ جو اپنے رب کی طرف سے ایک صاف و صریح

---

دی اور اُس تعلیم کو پسند نہ کیا جو اللہ نے ان کو سیدھا راستہ بتانے کے لیے نازل کی تھی۔

۱۵ اس فقرے کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ جس تباہی سے وہ کافر دوچار ہوئے ویسی ہی تباہی اب اِن کافروں کے لیے مقدّر ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو نہیں مان رہے ہیں۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اُن لوگوں کی تباہی صرف دنیا کے عذاب پر ختم نہیں ہو گئی ہے بلکہ یہی تباہی اُن کے لیے آخرت میں بھی مقدر ہے۔

۱۶ جنگِ اُحُد میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہو کر چند صحابہ کے ساتھ ایک گھاٹی میں ٹھیرے ہوئے تھے اُس وقت ابو سفیان نے نعرہ لگایا لنا عُزّیٰ و لا عُزّیٰ لکم، "ہمارے پاس عُزّیٰ ہے اور تمہارا کوئی عزّیٰ نہیں ہے"۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا اسے جواب دو: اللّٰہ مولانا ولا مولیٰ لکم، "ہمارا حامی و ناصر اللہ ہے اور تمہارا حامی و ناصر کوئی نہیں"۔ حضور کا یہ جواب اِسی آیت سے ماخوذ تھا۔

۱۷ یعنی جس طرح جانور کھاتا ہے اور کچھ نہیں سوچتا کہ یہ رزق کہاں سے آیا ہے، کس کا پیدا کیا ہوا ہے، اور اس رزق کے ساتھ میرے اوپر رازق کے کیا حقوق عائد ہوتے ہیں، اسی طرح یہ لوگ بھی بس کھاتے جا رہے ہیں، چرنے چگنے سے آگے کسی چیز کی انہیں کوئی فکر نہیں ہے۔

۱۸ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکّہ سے نکلنے کا بڑا رنج تھا۔ جب آپ ہجرت پر مجبور ہوئے تو

ہدایت پر ہو، وہ اُن لوگوں کی طرح ہو جائے جن کے لیے اُن کا برا عمل خوشنما بنا دیا گیا ہے اور وہ اپنی خواہشات کے پیرو بن گئے ہیں[۱۹]۔ پرہیزگار لوگوں کے لیے جس جنت کا وعدہ کیا گیا ہے اس کی شان تو یہ ہے کہ اس میں نہریں بہ رہی ہوں گی نتھرے ہوئے پانی کی[۲۰]، نہریں بہ رہی ہوں گی

---

شہر سے باہر نکل کر آپ نے اُس کی طرف رُخ کر کے فرمایا تھا "اے مکہ، تو دنیا کے تمام شہروں میں خدا کو سب سے زیادہ محبوب ہے، اور خدا کے تمام شہروں میں مجھے سب سے بڑھ کر تجھ سے محبت ہے۔ اگر مشرکوں نے مجھے نہ نکالا ہوتا تو میں تجھے چھوڑ کر کبھی نہ نکلتا"۔ اسی پر ارشاد ہوا ہے کہ اہلِ مکہ تمہیں نکال کر اپنی جگہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ انہوں نے کوئی بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔ حالانکہ درحقیقت یہ حرکت کر کے انہوں نے اپنی شامت بلائی ہے۔ آیت کا اندازِ کلام صاف بتا رہا ہے کہ یہ ضرور ہجرت سے متصل ہی نازل ہوئی ہوگی۔

۱۹؎ یعنی آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ پیغمبر اور اس کے پیرووں کو جب خدا کی طرف سے ایک صاف اور سیدھا راستہ مل گیا ہے اور پوری بصیرت کی روشنی میں وہ اس پر قائم ہو چکے ہیں، تو اب وہ اُن لوگوں کے ساتھ چل سکیں جو اپنی پرانی جاہلیت کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں، جو اپنی ضلالتوں کو ہدایت اور اپنی بدکرداریوں کو خوبی سمجھ رہے ہیں، جو کسی دلیل کی بنا پر نہیں بلکہ محض اپنی خواہشات کی بنا پر یہ فیصلے کرتے ہیں کہ حق کیا ہے اور باطل کیا۔ اب تو نہ اِس دنیا میں اِن دونوں گروہوں کی زندگی ایک جیسی ہو سکتی ہے اور نہ آخرت میں ان کا انجام یکساں ہو سکتا ہے۔

۲۰؎ اصل الفاظ ہیں ماءٍ غیر آسنٍ۔ آسن اُس پانی کو کہتے ہیں جس کا مزا اور رنگ بدلا ہوا ہو، یا جس میں کسی طرح کی بُو پیدا ہو گئی ہو۔ دنیا میں دریاؤں اور نہروں کے پانی عموماً گدلے ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ ریت، مٹی اور بسا اوقات طرح طرح کی نباتات کے مل جانے سے ان کا رنگ اور مزا بدل جاتا ہے۔ اور کچھ نہ کچھ بُو بھی ان میں پائی جاتی ہے۔ اس لیے جنت کے دریاؤں اور نہروں کے پانی کی یہ تعریف بیان کی گئی ہے کہ وہ غیر آسن ہوگا۔ یعنی وہ خالص، صاف ستھرا پانی ہوگا۔ کسی قسم کی آمیزش اس میں نہ ہوگی۔

ایسے دودھ کی جس کے مزے میں ذرا فرق نہ آیا ہوگا،[۲۱] نہریں بہ رہی ہونگی ایسی شراب کی جو پینے
والوں کے لیے لذیذ ہوگی،[۲۲] نہریں بہ رہی ہونگی صاف شفاف شہد کی۔[۲۳] اُس میں اُن کے لیے
ہر طرح کے پھل ہونگے اور اُن کے رب کی طرف سے بخشش[۲۴] (کیا وہ شخص جس کے حصّہ میں

---

۲۱؎ حدیثِ مرفوع میں اس کی تشریح یہ آئی ہے کہ "وہ جانوروں کے تھنوں سے نکلا ہُوا دودھ نہ ہوگا"۔ یعنی اللہ تعالیٰ یہ دودھ چشموں کی شکل میں زمین سے نکالے گا اور نہروں کی شکل میں اسے بہا دے گا۔ ایسا نہ ہوگا کہ جانوروں کے تھنوں سے اس کو نچوڑا جائے اور پھر جنت کی نہروں میں ڈال دیا جائے۔ اس قدرتی دودھ کی تعریف میں بیان کیا گیا ہے کہ "اس کے مزے میں ذرا فرق نہ آیا ہوگا"، یعنی اُس کے اندر وہ ذرا سی بساند بھی نہ ہوگی جو جانور کے تھن سے نکلے ہوئے ہر دودھ میں ہوتی ہے۔

۲۲؎ حدیث مرفوع میں اس کی تشریح یہ آئی ہے کہ اس شراب کو "انسانوں نے اپنے قدموں سے رَوند کر نہ نچوڑا ہوگا"۔ یعنی وہ دنیا کی شرابوں کی طرح پھلوں کو سڑا کر اور قدموں سے روند کر کشید کی ہوئی نہ ہوگی، بلکہ اللہ تعالیٰ اسے بھی چشموں کی شکل میں پیدا کرے گا اور نہروں کی شکل میں بہا دے گا۔ پھر اس کی تعریف یہ بیان کی گئی ہے کہ "وہ پینے والوں کے لیے لذیذ ہوگی"، یعنی دنیا کی شرابوں کی طرح وہ تلخ اور بُودار نہ ہوگی جسے کوئی بڑے سے بڑا شراب کا رسیا بھی کچھ نہ کچھ منہ بنائے بغیر نہیں پی سکتا۔ سورۂ صافات میں اس کی مزید تعریف یہ کی گئی ہے کہ اس کے پینے سے نہ جسم کو کوئی ضرر ہوگا نہ عقل خراب ہوگی (آیت ۴۷)، اور سورۂ واقعہ میں فرمایا گیا ہے کہ اس سے نہ دورانِ سر لاحق ہوگا نہ آدمی بہکے گا (آیت ۱۹)۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ شراب نشہ آور نہ ہوگی بلکہ محض لذّت و سرور بخشنے والی ہوگی۔

۲۳؎ حدیثِ مرفوع میں اس کی تشریح یہ آئی ہے کہ "وہ مکھیوں کے پیٹ سے نکلا ہُوا شہد نہ ہوگا"۔ یعنی وہ بھی چشموں سے نکلے گا اور نہروں میں بہے گا۔ اسی لیے اس کے اندر موم اور چھتے کے ٹکڑے اور مری ہوئی مکھیوں کی ٹانگیں ملی ہوئی نہ ہونگی، بلکہ وہ خالص شہد ہوگا۔

۲۴؎ جنت کی اِن نعمتوں کے بعد اللہ کی طرف سے مغفرت کا ذکر کرنے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ ان ساری نعمتوں سے بڑھ کر یہ نعمت ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرما دے گا۔ دوسرا مطلب یہ

یہ جنت آنے والی ہے ) اُن لوگوں کی طرح ہو سکتا ہے جو جہنّم میں ہمیشہ رہیں گے اور جنہیں ایسا گرم پانی پلایا جائے گا جو ان کی آنتیں تک کاٹ دیگا ؟

اِن میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو کان لگا کر تمہاری بات سنتے ہیں اور پھر جب تمہارے پاس سے نکلتے ہیں تو اُن لوگوں سے جنہیں علم کی نعمت بخشی گئی ہے پوچھتے ہیں کہ ابھی ابھی اِنہوں نے کیا کہا تھا؟[۲۵] یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے ٹھپّہ لگا دیا ہے اور یہ اپنی خواہشات کے پیرو بنے ہوئے ہیں[۲۶]۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے ہدایت پائی ہے، اللہ اُن کو اور زیادہ ہدایت دیتا ہے[۲۷] اور انہیں اُن کے حصّے کا تقویٰ عطا فرماتا ہے[۲۸]۔ اب کیا یہ لوگ بس قیامت ہی کے

---

کہ دنیا میں جو کوتاہیاں اُن سے ہوئی تھیں ان کا ذکر تک جنت میں کبھی اُن کے سامنے نہ آئے گا بلکہ اللہ تعالیٰ ان پر ہمیشہ کے لیے پردہ ڈال دے گا تاکہ جنت میں وہ شرمندہ نہ ہوں۔

۲۵؎ یہ اُن کفار و منافقین اور منکرینِ اہلِ کتاب کا ذکر ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی مجلس میں آکر بیٹھتے تھے اور آپ کے ارشادات، یا قرآن مجید کی آیات سنتے تھے، مگر چونکہ اُن کا دل اُن مضامین سے دُور تھا جو آپ کی زبانِ مبارک سے ادا ہوتے تھے، اس لیے سب کچھ سُن کر بھی وہ کچھ نہ سنتے تھے اور باہر نکل کر مسلمانوں سے پوچھتے تھے کہ ابھی ابھی آپ کیا فرما رہے تھے۔

۲۶؎ یہ تھا وہ اصل سبب جس کی وجہ سے ان کے دل کے کان نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشادات کے لیے بہرے ہو گئے تھے۔ وہ اپنی خواہشات کے بندے تھے، اور حضور جو تعلیمات پیش فرما رہے تھے وہ ان کی خواہشات کے خلاف تھیں، اس لیے اگر وہ کبھی آپ کی مجلس میں آکر تکلف آپ کی طرف کان لگاتے بھی تھے تو ان کے پلّے کچھ نہ پڑتا تھا۔

۲۷؎ یعنی وہی باتیں، جن کو سُن کر کفار و منافقین پوچھتے ہیں کہ ابھی ابھی آپ کیا فرما رہے تھے، ہدایت یافتہ لوگوں کے لیے مزید ہدایت کی موجب ہوتی ہیں، اور جس مجلس سے وہ بدنصیب اپنا وقت ضائع کر کے اٹھتے ہیں، اُسی مجلس سے یہ خوش نصیب لوگ علم و عرفان کا ایک نیا خزانہ حاصل کر کے پلٹتے ہیں۔

منتظر ہیں کہ وہ اچانک اِن پر آجائے؟[۲۹] اُس کی علامات تو آچکی ہیں[۳۰]۔ جب وہ خود آ جائے گی تو ان کے لیے نصیحت قبول کرنے کا کونسا موقع باقی رہ جائے گا؟

پس اَے نبی، خوب جان لو کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے، اور معافی مانگو اپنے قصور کے لیے بھی اور مومن مردوں اور عورتوں کے لیے بھی[۳۱]۔ اللہ تمہاری سرگرمیوں

---

۲۸؎ یعنی جس تقویٰ کی اہلیت وہ اپنے اندر پیدا کر لیتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس کی توفیق انہیں عطا فرما دیتا ہے۔

۲۹؎ یعنی جہاں تک حق واضح کرنے کا تعلق ہے وہ تو دلائل سے، قرآن کے معجزانہ بیان سے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ پاک سے، اور صحابۂ کرام کی زندگیوں کے انقلاب سے، انتہائی روشن طریقے پر واضح کیا جا چکا ہے، اب کیا ایمان لانے کے لیے یہ لوگ اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ قیامت اِن کے سامنے آ کھڑی ہو؟

۳۰؎ قیامت کی علامات سے مراد وہ علامات ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس کی آمد کا وقت اب قریب آ لگا ہے۔ ان میں سے ایک اہم علامت خدا کے آخری نبی کا آجانا ہے جس کے بعد پھر قیامت تک کوئی اور نبی آنے والا نہیں ہے۔ بخاری، مسلم، ترمذی اور مُسند احمد میں حضرت انس، حضرت سَہل بن سَعد ساعِدی، اور حضرت بُرَیدہ کی روایات منقول ہیں کہ حضورؐ نے اپنی انگشتِ شہادت اور بیچ کی انگلی کھڑی کر کے فرمایا: بُعِثتُ انا والساعۃ کھاتین "میری بعثت اور قیامت اِن دو انگلیوں کی طرح ہیں"۔ یعنی جس طرح ان دو انگلیوں کے درمیان کوئی اور انگلی نہیں ہے، اسی طرح میرے اور قیامت کے درمیان کوئی اور نبی بھی مبعوث ہونے والا نہیں ہے۔ میرے بعد اب بس قیامت ہی آنے والی ہے۔

۳۱؎ اسلام نے جو اخلاق انسان کو سکھائے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بندہ اپنے رب کی بندگی و عبادت بجا لانے میں، اور اس کے دین کی خاطر جان لڑانے میں، خواہ اپنی حد تک کتنی ہی کوشش کرتا رہا ہو، اس کو کبھی اِس زعم میں مبتلا نہ ہونا چاہیے کہ جو کچھ مجھے کرنا چاہیے تھا وہ میں نے کر دیا ہے، بلکہ اسے ہمیشہ یہی سمجھتے رہنا چاہیے کہ میرے مالک کا مجھ پر جو حق تھا وہ میں ادا نہیں کر سکا

۲ع کو بھی جانتا ہے اور تمہارے ٹھکانے سے بھی واقف ہے ؏

جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ کہہ رہے تھے کہ کوئی سورت کیوں نہیں نازل کی جاتی (جس میں جنگ کا حکم دیا جائے)۔ مگر جب ایک محکم سورت نازل کر دی گئی جس میں جنگ کا ذکر تھا تو تم نے دیکھا کہ جن کے دلوں میں بیماری تھی وہ تمہاری طرف اس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے کسی پر موت چھا گئی ہو۔[۳۲] افسوس اُن کے حال پر۔ (اُن کی زبان پر ہے) اطاعت کا اقرار اور

ہوں، اور ہر وقت اپنے قصور کا اعتراف کر کے اللہ سے یہی دعا کرتے رہنا چاہیے کہ تیری خدمت میں جو کچھ بھی کوتاہی مجھ سے ہوئی ہے اس سے درگزر فرما یہی اصل روح ہے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی کہ "اے نبی، اپنے قصور کی معافی مانگو"۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ معاذ اللہ، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فی الواقع جان بوجھ کر کوئی قصور کیا تھا۔ بلکہ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ تمام بندگانِ خدا سے بڑھ کر جو بندہ اپنے رب کی بندگی بجا لانے والا تھا، اس کا منصب بھی یہ نہ تھا کہ اپنے کارنامے پر فخر کا کوئی شائبہ تک اس کے دل میں راہ پاتے، بلکہ اس کا مقام بھی یہ تھا کہ اپنی ساری عظیم القدر خدمات کے باوجود اپنے رب کے حضور اعترافِ قصور ہی کرتا رہے۔ اسی کیفیت کا اثر تھا جس کے تحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ بکثرت استغفار فرماتے رہتے تھے۔ ابوداؤد، نسائی اور مسند احمد کی روایت میں حضور کا یہ ارشاد منقول ہوا ہے کہ "میں ہر روز سو بار اللہ سے استغفار کرتا ہوں"۔

[۳۲] مطلب یہ ہے کہ جن حالات سے اُس وقت مسلمان گزر رہے تھے اور کفار کا جو رویہ اُس وقت اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ تھا، اس کی بنا پر جنگ کا حکم آنے سے پہلے ہی اہلِ ایمان کی عام رائے یہ تھی کہ اب ہمیں جنگ کی اجازت مل جانی چاہیے۔ بلکہ وہ بے چینی کے ساتھ اللہ کے فرمان کا انتظار کر رہے تھے اور بار بار پوچھتے تھے کہ ہمیں ان ظالموں سے لڑنے کا حکم کیوں نہیں دیا جاتا۔ مگر جو لوگ منافقت کے ساتھ مسلمانوں کے گروہ میں شامل ہو گئے تھے ان کا حال مومنوں کے حال سے بالکل مختلف تھا۔ وہ اپنی جان و مال کو خدا اور اس کے دین سے عزیز تر رکھتے تھے اور اس کے لیے کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھے۔ جنگ کے حکم نے آتے ہی ان کو اور سچے اہلِ ایمان کو ایک دوسرے

اچھی اچھی باتیں۔ مگر جب قطعی حکم دے دیا گیا اُس وقت وہ اللہ سے اپنے عہد میں سچے نکلتے تو انہی کے لیے اچھا تھا۔ اب کیا تم لوگوں سے اس کے سوا کچھ اور توقع کی جا سکتی ہے کہ اگر تم اُلٹے مُنہ پھر گئے ؂۳۳ تو زمین میں پھر فساد برپا کرو گے اور آپس میں ایک دوسرے کے گلے کاٹو گے ؂۳۴؟

---

سے چھانٹ کر الگ کر دیا۔ جب تک یہ حکم نہ آیا تھا، ان میں اور عام اہل ایمان میں بظاہر کوئی فرق و امتیاز نہ پایا جاتا تھا۔ نماز وہ بھی پڑھتے تھے اور یہ بھی۔ روزے رکھنے میں بھی انہیں تامل نہ تھا۔ ٹھنڈا ٹھنڈا اسلام انہیں قبول تھا۔ مگر جب اسلام کے لیے جان کی بازی لگانے کا وقت آیا تو ان کے نفاق کا حال کھل گیا اور نمائشی ایمان کا وہ لبادہ اُتر گیا جو انہوں نے اُوپر سے اوڑھ رکھا تھا۔ سورۂ نساء میں ان کی اس کیفیت کو یوں بیان کیا گیا ہے: "تم نے دیکھا اُن لوگوں کو جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو؟ اب جو انہیں لڑائی کا حکم دے دیا گیا تو ان میں سے ایک گروہ کا حال یہ ہے کہ انسانوں سے اس طرح ڈر رہے ہیں جیسے خدا سے ڈرنا چاہیے، بلکہ کچھ اس سے بھی زیادہ۔ کہتے ہیں، خدایا، یہ لڑائی کا حکم ہمیں کیوں دے دیا۔ ہمیں ابھی اور کچھ مہلت کیوں نہ دی؟" (آیت ۷۷)

؂۳۳ اصل الفاظ ہیں اِنْ تَوَلَّيْتُمْ۔ ان کا ایک ترجمہ وہ ہے جو ہم نے اوپر متن میں کیا ہے۔ اور دوسرا ترجمہ یہ ہے کہ "اگر تم لوگوں کے حاکم بن گئے"۔

؂۳۴ اس ارشاد کا ایک مطلب یہ ہے کہ اگر اِس وقت تم اسلام کی مدافعت سے جی چُراتے ہو اور اُس عظیم الشان اصلاحی انقلاب کے لیے جان و مال کی بازی لگانے سے مُنہ موڑتے ہو جس کی کوشش محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان کر رہے ہیں، تو اس کا نتیجہ آخر اِس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ تم پھر اُسی جاہلیت کے نظام کی طرف پلٹ جاؤ جس میں تم لوگ صدیوں سے ایک دوسرے کے گلے کاٹتے رہے ہو، اپنی اولاد تک کو زندہ دفن کرتے رہے ہو، اور خدا کی زمین کو ظلم و فساد سے بھرتے رہے ہو۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ جب تمہاری سیرت و کردار کا حال یہ ہے کہ جس دین پر ایمان لانے کا تم نے اقرار کیا تھا اس کے لیے تمہارے اندر کوئی اخلاص اور کوئی وفاداری نہیں ہے، اور

اس کی خاطر کوئی قربانی دینے کے لیے تم تیار نہیں ہو، تو اس اخلاقی حالت کے ساتھ اگر اللہ تعالیٰ تمہیں اقتدار عطا کر دے اور دنیا کے معاملات کی باگیں تمہارے ہاتھ میں آ جائیں تو تم سے ظلم و فساد اور بدکرداری کے سوا اور کس چیز کی توقع کی جا سکتی ہے۔

یہ آیت اس امر کی صراحت کرتی ہے کہ اسلام میں قطع رحمی حرام ہے۔ دوسری طرف مثبت طریقہ سے بھی قرآن مجید میں متعدد مقامات پر رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک کو بڑی نیکیوں میں شمار کیا گیا ہے اور صلۂ رحمی کا حکم دیا گیا ہے (مثال کے طور پر ملاحظہ ہو البقرہ، ۸۳-۱۷۷، النساء ۸-۳۶، النحل، ۹۰، بنی اسرائیل، ۲۶-النور، ۲۲)۔ رحم کا لفظ عربی زبان میں قرابت اور رشتہ داری کے لیے استعارہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ ایک شخص کے تمام رشتہ دار، خواہ وہ دور کے ہوں یا قریب کے، اس کے ذوی الارحام ہیں۔ جس سے جتنا زیادہ قریب کا رشتہ ہو اس کا حق آدمی پر اتنا ہی زیادہ ہے اور اس سے قطع رحمی کرنا اتنا ہی بڑا گناہ ہے۔ صلۂ رحمی یہ ہے کہ اپنے رشتہ دار کے ساتھ جو نیکی کرنا بھی آدمی کی استطاعت میں ہو اس سے دریغ نہ کرے۔ اور قطع رحمی یہ ہے کہ آدمی اس کے ساتھ بُرا سلوک کرے، یا جو بھلائی کرنا اس کے لیے ممکن ہو اس سے قصداً پہلو تہی کرے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی آیت سے استدلال کر کے امّ ولد کی بیع کو حرام قرار دیا تھا اور صحابہ کرام نے اس سے اتفاق فرمایا تھا۔ حاکم نے مستدرک میں حضرت بُرَیدہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک روز میں حضرت عمرؓ کی مجلس میں بیٹھا تھا کہ یکایک محلہ میں شور مچ گیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک لونڈی فروخت کی جا رہی ہے اور اس کی لڑکی رو رہی ہے۔ حضرت عمرؓ نے اسی وقت انصار و مہاجرین کو جمع کیا اور ان سے پوچھا کہ جو دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں کیا اس میں آپ حضرات کو قطع رحمی کا بھی کوئی جواز ملتا ہے؟ سب نے کہا نہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا پھر یہ کیا بات ہے کہ آپ کے ہاں ماں کو بیٹی سے جدا کیا جا رہا ہے؟ اس سے بڑی قطع رحمی اور کیا ہو سکتی ہے؟ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ لوگوں نے کہا آپ کی رائے میں اس کو روکنے کے لیے جو صورت مناسب ہو وہ اختیار فرمائیں۔ اس پر حضرت عمرؓ

یہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی اور ان کو اندھا اور بہرا بنا دیا۔ کیا ان لوگوں نے قرآن پر غور نہیں کیا، یا دلوں پر اُن کے قفل چڑھے ہوئے ہیں[۳۵]؟ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ہدایت واضح ہو جانے کے بعد اُس سے پھر گئے اُن کے لیے شیطان نے اِس روش کو سہل بنا دیا ہے اور جھوٹی توقعات کا سلسلہ اُن کے لیے دراز کر رکھا ہے۔ اِسی لیے انہوں نے اللہ کے نازل کردہ دین کو ناپسند کرنے والوں سے کہدیا کہ بعض معاملات میں ہم تمہاری مانیں گے[۳۶]۔ اللہ اُن کی یہ خفیہ باتیں خوب جانتا ہے۔ پھر اس وقت کیا حال ہو گا جب فرشتے ان کی روحیں قبض کریں گے اور اِن کے مُنہ اور پیٹھوں پر مارتے ہوئے انہیں لے جائیں گے[۳۷]؟ یہ

نے تمام بلادِ اسلامیہ کے لیے یہ فرمانِ عام جاری کر دیا کہ کسی ایسی لونڈی کو فروخت نہ کیا جائے جس سے اس کے مالک کے ہاں اولاد پیدا ہو چکی ہو، کیونکہ یہ قطع رحمی ہے اور یہ حلال نہیں ہے۔

۳۵؎ یعنی یا تو یہ لوگ قرآن مجید پر غور نہیں کرتے۔ یا غور کرنے کی کوشش تو کرتے ہیں مگر اس کی تعلیمات اور اس کے معانی و مطالب ان کے دلوں میں اترتے نہیں ہیں کیونکہ ان کے دلوں پر قفل چڑھے ہوئے ہیں۔ اور یہ جو فرمایا کہ "دلوں پر اُن کے قفل چڑھے ہوئے ہیں" تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان پر وہ قفل چڑھے ہوئے ہیں جو ایسے حق ناشناس دلوں کے لیے مخصوص ہیں۔

۳۶؎ یعنی ایمان کا اقرار کرنے اور مسلمانوں کے گروہ میں شامل ہو جانے کے باوجود وہ اندر ہی اندر دشمنانِ اسلام سے ساز باز کرتے رہے اور ان سے وعدے کرتے رہے کہ بعض معاملات میں ہم تمہارا ساتھ دیں گے۔

۳۷؎ یعنی دنیا میں تو یہ طرزِ عمل انہوں نے اس لیے اختیار کر لیا کہ اپنے مفادات کی حفاظت کرتے رہیں اور کفر و اسلام کی جنگ کے خطرات سے اپنے آپ کو بچاتے رکھیں، لیکن مرنے کے بعد یہ خدا کی گرفت سے بچ کر کہاں جائیں گے۔ اُس وقت تو ان کی کوئی تدبیر فرشتوں کی مار سے ان کو نہ بچا سکے گی۔

یہ آیت بھی اُن آیات میں سے ہے جو عذاب برزخ (یعنی عذاب قبر) کی تصریح کرتی ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ موت کے وقت ہی کفار و منافقین پر عذاب شروع ہو جاتا ہے، اور یہ

اسی لیے تو ہوگا کہ انہوں نے اُس طریقے کی پیروی کی جو اللہ کو ناراض کرنے والا ہے اور اُس کی رضا کا راستہ اختیار کرنا پسند نہ کیا۔ اسی بنا پر اس نے ان کے سب اعمال ضائع کر دیئے ع۳ ۳۳؎

کیا وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ اللہ ان کے دلوں کے کھوٹ ظاہر نہیں کرے گا؟ ہم چاہیں تو انہیں تم کو آنکھوں سے دکھا دیں اور اُن کے چہروں سے تم ان کو پہچان لو۔ مگر ان کے اندازِ کلام سے تو تم ان کو جان ہی لوگے۔ اللہ تم سب کے اعمال سے خوب واقف ہے۔ ہم ضرور تم لوگوں کو آزمائش میں ڈالیں گے تاکہ تمہارے حالات کی جانچ کریں اور دیکھ لیں کہ تم میں مجاہد اور ثابت قدم کون ہیں۔

جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کی راہ سے روکا اور رسول سے جھگڑا کیا جبکہ ان پر راہِ راست واضح ہو چکی تھی، درحقیقت وہ اللہ کا کوئی نقصان بھی نہیں کر سکتے، بلکہ اللہ

---

عذاب اُس سزا سے مختلف چیز ہے جو قیامت میں ان کے مقدمے کا فیصلہ ہونے کے بعد اُن کو دی جائے گی۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اوّل، ص ۳۸۶-۴۵۶۔ جلد دوم، ص ۱۵۰-۵۲۵-۵۲۸۔ جلد سوم، ص ۲۹۹-۳۰۰۔ جلد چہارم، یٰسٓ، حاشیہ ۲۲-۲۳۔ المومن حاشیہ ۶۳)۔

۳۳؎ اعمال سے مراد وہ تمام اعمال ہیں جو مسلمان بن کر وہ انجام دیتے رہے۔ ان کی نمازیں ان کے روزے، ان کی زکوٰۃ، غرض وہ تمام عبادتیں اور وہ ساری نیکیاں جو اپنی ظاہری شکل کے اعتبار سے اعمالِ خیر میں شمار ہوتی تھیں، اس بنا پر ضائع ہو گئیں کہ انہوں نے مسلمان ہوتے ہوئے بھی اللہ اور اُس کے دین اور ملّتِ اسلامیہ کے ساتھ اخلاص و وفاداری کا رویّہ اختیار نہ کیا، بلکہ محض اپنے دنیوی مفاد کے لیے دشمنانِ دین کے ساتھ سازباز کرتے رہے اور اللہ کی راہ میں جہاد کا موقع آتے ہی اپنے آپ کو خطرات سے بچانے کی فکر میں لگ گئے۔

یہ آیات اِس معاملہ میں بالکل ناطق ہیں کہ کفر و اسلام کی جنگ میں جس شخص کی ہمدردیاں اسلام

ہی ان کا سب کیا کرایا غارت کر دے گا۔[۳۹] اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تم اللہ کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو برباد نہ کر لو۔[۴۰] کفر کرنے والوں اور راہِ خدا سے روکنے والوں اور مرتے دم تک کفر پر جمے رہنے والوں کو تو اللہ ہرگز معاف نہ کرے گا۔ پس تم بودے نہ بنو اور صلح کی درخواست نہ کرو۔[۴۱] تم ہی غالب رہنے والے ہو۔ اللہ تمہارے ساتھ ہے اور تمہارے اعمال کو وہ ہرگز ضائع نہ کرے گا۔ یہ دنیا کی زندگی تو ایک کھیل اور تماشا ہے۔[۴۲]

---

اور مسلمانوں کے ساتھ نہ ہوں، یا کفر اور کفار کے ساتھ ہوں، اس کا ایمان ہی سرے سے معتبر نہیں ہے کجا کہ اس کا کوئی عمل خدا کے ہاں مقبول ہو۔

۳۹؎ اس فقرے کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ جن کاموں کو انہوں نے اپنے نزدیک نیک سمجھ کر کیا ہے، اللہ ان سب کو ضائع کر دے گا اور آخرت میں اُن کا کوئی اجر بھی وہ نہ پا سکیں گے۔ دوسرا مطلب یہ کہ جو تدبیریں بھی وہ اللہ اور اس کے رسول کے دین کا راستہ روکنے کے لیے کر رہے ہیں وہ سب ناکام و نامراد ہو جائیں گی۔

۴۰؎ بالفاظِ دیگر اعمال کے نافع اور نتیجہ خیز ہونے کا سارا انحصار اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت پر ہے۔ اطاعت سے منحرف ہو جانے کے بعد کوئی عمل بھی عملِ خیر نہیں رہتا کہ آدمی اس پر کوئی اجر پانے کا مستحق ہو سکے۔

۴۱؎ یہاں یہ بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ یہ ارشاد اُس زمانے میں فرمایا گیا ہے جب صرف مدینے کی چھوٹی سی بستی میں چند سو مہاجرین و انصار کی ایک مٹھی بھر جمعیت اسلام کی علمبرداری کر رہی تھی اور اس کا مقابلہ محض قریش کے طاقتور قبیلے ہی سے نہیں بلکہ پورے ملک عرب کے کفار و مشرکین سے تھا۔ اس حالت میں فرمایا جا رہا ہے کہ ہمت ہار کر ان دشمنوں سے صلح کی درخواست نہ کرنے لگو، بلکہ سر دھڑ کی بازی لگا دینے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اس ارشاد کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مسلمانوں کو کبھی صلح کی بات چیت کرنی ہی نہ چاہیے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی حالت میں صلح کا سلسلہ جنبانی کرنا درست نہیں ہے جب اس کے معنی اپنی کمزوری کے اظہار کے ہوں اور اس سے دشمن اور زیادہ دلیر ہو جائیں۔

اگر تم ایمان رکھو اور تقویٰ کی روش پر چلتے رہو تو اللہ تمہارے اجر تم کو دے گا اور وہ تمہارے مال تم سے نہ مانگے گا[۴۳]۔ اگر کہیں وہ تمہارے مال تم سے مانگ لے اور سب کے سب تم سے طلب کر لے تو تم بخل کرو گے اور وہ تمہارے کھوٹ اُبھار لائے گا[۴۴]۔ دیکھو، تم لوگوں کو دعوت دی جا رہی ہے کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو۔ اس پر تم میں سے کچھ لوگ ہیں جو بخل کر رہے ہیں، حالانکہ جو بخل کرتا ہے وہ درحقیقت اپنے آپ ہی سے بخل کر رہا ہے۔ اللہ تو غنی ہے، تم ہی اس کے محتاج ہو۔ اگر تم منہ موڑو گے تو اللہ تمہاری جگہ کسی اور
قوم کو لے آئے گا اور وہ تم جیسے نہ ہوں گے۔ ع ع۴

---

مسلمانوں کو پہلے اپنی طاقت کا لوہا منوا لینا چاہیے، اس کے بعد وہ صلح کی بات چیت کریں تو مضائقہ نہیں۔

۴۲ یعنی آخرت کے مقابلے میں اِس دنیا کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ چند روز کا دل بہلاوا ہے۔ یہاں کی کامرانی و ناکامی کوئی حقیقی اور پائیدار چیز نہیں ہے جسے کوئی اہمیت حاصل ہو۔ اصل زندگی آخرت کی ہے جس کی کامیابی کے لیے انسان کو فکر کرنی چاہیے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم، ص ۷۱۹)

۴۳ یعنی وہ غنی ہے، اسے اپنی ذات کے لیے تم سے لینے کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ اگر وہ اپنی راہ میں تم سے کچھ خرچ کرنے کے لیے کہتا ہے تو وہ اپنے لیے نہیں بلکہ تمہاری ہی بھلائی کے لیے کہتا ہے۔

۴۴ یعنی اتنی بڑی آزمائش میں وہ تمہیں نہیں ڈالتا جس سے تمہاری کمزوریاں ابھر آئیں۔

# امام ابو حنیفہؒ کا کارنامہ

ابو الاعلیٰ مودودی

اس سے پہلے ان صفحات میں ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ ملوکیت کا آغاز ہوتے ہی امّت کی قیادت دو حصّوں میں بٹ گئی تھی۔ ایک، سیاسی قیادت جس کی زمامِ کار ملوک و اُمراء اور سلاطین کے ہاتھ میں رہی۔ اور دوسری، دینی قیادت جسے امت کے علماء و صلحاء نے سنبھال لیا۔ قیادت کی اِس تفریق کے اسباب و نتائج پر ہم اس سے پہلے مفصل بحث کر چکے ہیں اور یہ بھی بتا چکے ہیں کہ اس دَورِ تفریق میں سیاسی قیادت کا کیا رنگ تھا۔ اب ہم ایک نظر یہ بھی دکھانا چاہتے ہیں کہ وہ لوگ کیسے تھے جنہوں نے امت کی دینی قیادت سنبھالی، اور کس طرح اُنہوں نے وہ مسائل حل کیے جو اس دَور میں پیدا ہوئے تھے۔ اس مقصد کے لیے ہم امام ابو حنیفہ کو دینی قیادت کے ایک نمائندے کی حیثیت سے لے کر یہاں اُن کا کارنامہ پیش کریں گے، اور اس کے بعد یہ بتائیں گے کہ ان کے شاگرد امام ابو یوسف نے ان کے کام کی تکمیل کس طرح کی۔

**مختصر حالاتِ زندگی** امام کا اسمِ گرامی نعمان بن ثابت تھا عراق کے دار الحکومت کوفہ میں انکی پیدائش معتبر روایات کے مطابق ۸۰ھ (۶۹۹ء) میں ہوئی۔ عبد الملک بن مروان اُس وقت اُموی خلیفہ تھا اور حجاج بن یوسف عراق کا گورنر۔ انہوں نے اپنی زندگی کے ۵۲ سال بنی امیہ کے عہد میں اور ۱۸ سال بنی عباس کے عہد میں گزارے۔ حجاج بن یوسف کی موت کے وقت وہ ۱۵ سال کے تھے۔ عمر بن عبد العزیزؒ کے زمانے میں وہ جوان تھے۔ یزید بن المُہَلَّب، خالد بن عبد اللہ القسری اور نصر بن سیّار کی ولایتِ عراق کے طوفانی عہد ان کی آنکھوں کے سامنے گزرے۔ ابن ہُبیرہ آخری اُموی گورنر کے ظلم و ستم کا وہ خود نشانہ بنے۔ پھر ان کے سامنے ہی عباسی دعوت اُٹھی۔ اس کا مرکز ان کا اپنا شہر کوفہ تھا، اور بغداد کی تعمیر سے پہلے تک کوفے ہی کو عملاً نوخیز دولتِ عباسیہ

کے مرکز کی حیثیت حاصل رہی۔ خلیفہ المنصور کے عہد میں ۱۵۰ھ (۷۶۷ء) میں انہوں نے وفات پائی۔

ان کا خاندان ابتداءً کابل میں آباد تھا۔ ان کے دادا، جن کا نام بعض نے زُوطی اور بعض نے زَوطیٰ لکھا ہے، جنگ میں گرفتار ہو کر کوفہ آئے اور مسلمان ہو کر یہیں بنی تَیم اللہ کی وِلاء (PATRONAGE) میں رہ پڑے۔ ان کا پیشہ تجارت تھا۔ حضرت علیؓ سے اُن کی ملاقات تھی اور اس حد تک تعلقات تھے کہ وہ کبھی کبھی ان کی خدمت میں ہدیے بھیجتے رہتے تھے[۱]۔ ان کے بیٹے ثابت (امام ابوحنیفہ کے والد) بھی کوفے میں تجارت کرتے تھے۔ امام کی اپنی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ کوفے میں اُن کی روٹیوں کی دوکان (BAKERY) تھی[۲]۔

امام کی تعلیم کے متعلق ان کا اپنا بیان یہ ہے کہ ابتداءً انہوں نے قراءت، حدیث، نحو، ادب، شعر، کلام وغیرہ تمام اُن علوم کا مطالعہ کیا تھا جو اس زمانے میں متداول تھے[۳]۔ اس کے بعد انہوں نے علمِ کلام میں اختصاص پیدا کیا اور ایک مدت اس میں مشغول رہ کر اس مرتبے تک ترقی کر گئے کہ اس فن میں ان کی طرف نگاہیں اٹھنے لگیں۔ ان کے مشہور شاگرد زُفَر بن الہُذَیل کی روایت ہے کہ امام نے ان سے کہا "پہلے میں علمِ کلام سے دلچسپی رکھتا تھا اور اس حد کو پہنچ گیا تھا کہ میری طرف اشارے کیے جاتے تھے[۴]"۔ ایک اور روایت میں امام خود فرماتے ہیں:

"میں ایک ایسا شخص تھا جسے علمِ کلام کی بحثوں میں مہارت حاصل تھی۔ ایک زمانہ ایسا گزرا کہ میں انہی بحثوں اور مناظروں میں مشغول رہتا تھا۔ اور چونکہ اختلافات کا اکھاڑہ زیادہ تر بصرے میں تھا اس لیے میں تقریباً ۲۰ مرتبہ وہاں گیا اور کبھی کبھی سال چھ مہینے بھی وہاں

---

[۱] الکَردَری، مناقب الامام الاعظم، ج ۱، ص ۶۵-۶۶، طبع اوّل ۱۳۲۱ھ، دائرۃ المعارف، حیدرآباد

[۲] المکّی، الموفّق بن احمد، مناقب الامام الاعظم ابی حنیفہ، ج ۱، ص ۱۶۲، طبع اوّل ۱۳۲۱ھ، دائرۃ المعارف، حیدرآباد

[۳] المکّی، ج ۱، ص ۵۷-۵۸ [۴] المکّی، ج ۱، ص ۵۵-۵۹

رہ کر خوارج کے مختلف گروہوں، اِباضِیہ، صُفرِیّہ وغیرہ سے اور حَشوِیّہ کے مختلف طبقوں سے مناظرے کرتا رہا۔[۵]

اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ امام نے اس وقت کے فلسفہ و منطق اور اختلافاتِ مذاہب کے متعلق بھی ضرور کافی واقفیت بہم پہنچائی ہوگی، کیونکہ اس کے بغیر علمِ کلام میں آدمی دخل نہیں دے سکتا۔ بعد میں انہوں نے قانون میں منطقی استدلال اور عقل کے استعمال کا جو کمال دکھایا اور بڑے بڑے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے میں جو شہرت حاصل کی وہ اسی ابتدائی ذہنی تربیت کا نتیجہ تھی۔

کافی مدت تک اس میں مشغول رہنے کے بعد کلامی جھگڑوں اور مجادلوں سے ان کا دل بیزار ہو گیا اور انہوں نے فقہ (اسلامی قانون) کی طرف توجہ کی۔ یہاں طبعًا ان کی دلچسپی اہل الحدیث کے مدرسۂ فکر سے نہ ہو سکتی تھی۔ عراق کے اصحاب الرائے کا مرکز اس وقت کوفہ تھا۔ اسی سے وہ وابستہ ہو گئے۔ اس مدرسۂ فکر کی ابتدا حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ (متوفی ۳۲ھ - ۶۵۲ء) سے ہوئی تھی۔ ان کے بعد ان کے شاگرد شُرَیح (م ۷۸ھ - ۶۹۷ء) عَلقَمہ (م ۶۲ھ - ۶۸۱ء) اور مَسروق (م ۶۳ھ - ۶۸۲ء) اس مدرسے کے نامور ائمہ ہوئے جن کا شہرہ اس وقت تمام دنیائے اسلام میں تھا۔ پھر ابراہیم نَخَعی (م ۹۵ھ - ۷۱۴ء) اور ان کے بعد حمّاد تک اس کی امامت پہنچی۔ انہی حمّاد کی شاگردی ابو حنیفہ نے اختیار کی اور ان کی وفات تک پورے ۱۸ سال ان کی صحبت میں رہے۔ مگر انہوں نے صرف اُسی علم پر اکتفا نہ کیا جو کوفہ میں ان کے اساتذہ کے پاس تھا، بلکہ بار بار حج کے موقع پر حجاز جا کر وہ فقہ اور حدیث کے دوسرے اکابر اہلِ علم سے بھی استفادہ کرتے رہے۔

۱۲۰ھ میں جب ان کے استاذ حمّاد کا انتقال ہوا تو اس مدرسۂ فکر کے لوگوں نے بالاتفاق امام ابو حنیفہ کو ان کا جانشین بنایا اور اس مسند پر ۳۰ سال تک درس و تدریس اور افتاء کا وہ لافانی کام انہوں نے انجام دیا جو آج مذہبِ حنفی کی بنیاد ہے۔ اس ۳۰ سال کی مدت میں انہوں نے

---

[۵] المکی، ج ۱، ص ۵۹

بقول بعض ۶۰ ہزار اور بقول بعض ۸۳ ہزار قانونی مسائل کے جوابات دیئے جو ان کی زندگی ہی میں الگ الگ عنوانات کے تحت مرتب کر دیئے گئے۔[۶] سات آٹھ سو کی تعداد میں ایسے شاگرد تیار کیے جو دنیائے اسلام کے مختلف علاقوں میں پہنچ کر درس و افتاء کے مسند نشین اور عوام کی عقیدتوں کے مرکز بن گئے۔ ان کے شاگردوں میں سے ۵۰ کے قریب ایسے آدمی نکلے جو ان کے بعد سلطنتِ عباسیہ کے قاضی ہوئے۔ ان کا مذہب اسلامی دنیا کے بہت بڑے حصے کا قانون بن گیا۔ وہی عباسی، سلجوقی، عثمانی اور مغل سلطنتوں کا قانون تھا، اور آج چین سے لے کر ٹرکی تک کے کروڑوں مسلمان اسی کی پیروی کرتے ہیں۔

معاش کے لیے امام نے اپنا آبائی پیشہ تجارت اختیار کیا۔ کوفہ میں وہ خزّ (ایک خاص قسم کے کپڑے) کی تجارت کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ انہوں نے اس پیشے میں بھی غیر معمولی ترقی کی۔ ان کا اپنا ایک بڑا کارخانہ تھا جس میں خزّ تیار کیا جاتا تھا۔[۷] ان کی تجارتی کوٹھی صرف کوفے ہی میں کپڑا فروخت نہیں کرتی تھی بلکہ اس کا مال دُور دراز علاقوں میں بھی جاتا تھا۔ پھر ان کی دیانت پر عام اعتماد جب بڑھا تو یہ کوٹھی عملاً ایک بینک بھی بن گئی جس میں لوگ کروڑوں روپیہ امانت رکھواتے تھے۔ ان کی وفات کے وقت ۵ کروڑ درہم کی امانتیں اس کوٹھی میں جمع تھیں۔[۸] مالی تجارتی معاملات کے متعلق اس وسیع تجربے نے ان کے اندر قانون کے بہت سے شعبوں میں وہ بصیرت پیدا کر دی تھی جو صرف علمی حیثیت سے قانون جاننے والوں کو نصیب نہیں ہوتی۔ فقہ اسلامی کی تدوین میں اس تجربے نے ان کو بڑی مدد دی۔ اس کے علاوہ دنیوی معاملات میں ان کی فراست و مہارت کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ جب ۱۴۵ھ (۷۶۲ء) میں المنصور نے بغداد کی تعمیر کا آغاز کیا تو ابوحنیفہ ہی کو اس کی نگرانی پر مقرر کیا اور

---

۶۔ المکی، ج ۱، ص ۹۶، ج ۲، ص ۱۳۲-۱۳۶

۷۔ الیافعی، مرآۃ الجنان وعبرۃ الیقظان، ج ۱، ص ۳۱۰ طبع اول، ۱۳۳۷ھ، دائرۃ المعارف حیدرآباد

۸۔ المکی، ج ۱، ص ۲۲۰

چار سال تک وہ اس کام کے نگرانِ اعلیٰ رہے۔[۹]

وہ اپنی شخصی زندگی میں انتہائی پرہیزگار اور دیانت دار آدمی تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے اپنے شریک کو مال بیچنے کے لیے باہر بھیجا۔ اس مال میں ایک حصّہ عیب دار تھا۔ امام نے شریک کو ہدایت کی کہ جس کے ہاتھ فروخت کرے اسے عیب سے آگاہ کر دے۔ مگر وہ اس بات کو بھول گیا اور سارا مال عیب ظاہر کیے بغیر فروخت کر آیا۔ امام نے اس پورے مال کی وصول شدہ قیمت (جو ۳۵ ہزار درہم تھی) خیرات کر دی۔[۱۰] مؤرخین نے متعدد واقعات ایسے بھی نقل کیے ہیں کہ ناتجربہ کار لوگ اگر اپنا مال فروخت کرنے کے لیے ان کی دوکان پر آتے اور مال کی قیمت کم بتاتے تو امام خود ان سے کہتے تھے کہ تمہارا مال زیادہ قیمتی ہے اور ان کو صحیح قیمت ادا کرتے تھے۔[۱۱] ان کے ہم عصر ان کی پرہیزگاری کی تعریف میں غیر معمولی طور پر رطب اللسان ہیں۔ مشہور امام حدیث عبداللہ بن المبارک کا قول ہے "میں نے ابوحنیفہ سے زیادہ پرہیزگار آدمی نہیں دیکھا۔ اس شخص کے متعلق کیا کہا جائے گا جس کے سامنے دنیا اور اس کی دولت پیش کی گئی اور اس نے ٹھکرا دیا، کوڑوں سے اس کو پیٹا گیا اور وہ ثابت قدم رہا، اور وہ مناصب جن کے پیچھے لوگ دوڑتے پھرتے ہیں کبھی قبول نہ کیے"۔[۱۲] قاضی ابن شُبرُمہ کہتے ہیں "دنیا ان کے پیچھے لگی مگر وہ اس سے بھاگے، اور ہم سے وہ بھاگی مگر ہم اس کے پیچھے لگے"۔[۱۳] حسن بن زیاد کہتے ہیں "خدا کی قسم، ابوحنیفہ نے کبھی کسی امیر کا عطیہ یا ہدیہ قبول نہیں کیا"۔[۱۴]

---

[۹] الطبری، ج ۶، ص ۲۳۸۔ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، ج ۱۰، ص ۹۷

[۱۰] الخطیب، تاریخ بغداد، ج ۱۳، ص ۳۵۸۔ ملا علی قاری، ذیل الجواہر المضیئہ، ص ۴۸۸، دائرۃ المعارف، حیدرآباد، طبع اول ۱۳۳۲ھ۔

[۱۱] المکی، ج ۱، ص ۲۱۹-۲۲۰

[۱۲] الذہبی، مناقب الامام ابی حنیفہ وصاحبیہ، ص ۱۱۵، دارالکتب العربی، مصر، ۱۳۶۶ھ

[۱۳] الراغب الاصفہانی، محاضرات الادباء، ص ۲۰۶، مطبعۃ الہلال، مصر، ۱۹۰۲ء [۱۴] الذہبی، ص ۲۶

ہارون الرشید نے ایک دفعہ امام ابو یوسف سے ابو حنیفہ کی صفت پوچھی۔ انہوں نے کہا:

"بخدا وہ اللہ کی حرام کردہ چیزوں سے سخت پرہیز کرنے والے، اہلِ دنیا سے مجتنب اور اکثر خاموش رہنے والے آدمی تھے۔ ہمیشہ غور و فکر میں لگے رہتے اور فضول باتیں کبھی نہ کرتے۔ اگر کوئی مسئلہ ان سے پوچھا جاتا اور ان کے پاس اس کے متعلق کوئی علم ہوتا تو جواب دے دیتے۔ امیر المومنین، میں تو بس یہ جانتا ہوں کہ وہ اپنے نفس اور دین کو برائیوں سے بچاتے تھے اور لوگوں سے بے نیاز ہو کر اپنے آپ سے مشغول رہتے تھے۔ وہ کبھی کسی کا ذکر برائی کے ساتھ نہ کرتے تھے۔"[۱۵]

وہ ایک نہایت فیاض آدمی تھے۔ خصوصاً اہلِ علم پر اور طلبہ پر اپنا مال بڑی دریا دلی سے خرچ کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے تجارتی منافع کا ایک خاص حصہ اس مقصد کے لیے الگ کر رکھا تھا جس سے سال بھر تک علما اور طلبہ کو باقاعدہ مالی اعانتیں دیتے رہتے اور آخر میں جو کچھ بچتا وہ انہی میں تقسیم کر دیتے۔ وہ ان کو مال دیتے وقت کہا کرتے: "آپ لوگ اسے اپنی ضروریات پر خرچ کریں اور اللہ کے سوا کسی کے شکر گزار نہ ہوں۔ میں نے آپ کو اپنے پاس سے کچھ نہیں دیا ہے یہ اللہ کا فضل ہے جو آپ ہی لوگوں کے لیے اس نے مجھ کو بخشا ہے۔"[۱۶] ان کے شاگردوں میں ایک کثیر تعداد ایسی تھی جن کے مصارف کی کفالت وہ خود کرتے تھے، اور امام ابو یوسف کے تو گھر کا پورا خرچ ہی انہوں نے اپنے ذمے لے رکھا تھا، کیونکہ ان کے والدین غریب تھے اور وہ اپنے لڑکے کی تعلیم چھڑا کر اسے کسی معاشی کام میں لگانا چاہتے تھے۔[۱۷]

اس سیرت اور شخصیت کا تھا وہ شخص جس نے دوسری صدی ہجری کے نصف اوّل میں قریب قریب ان تمام اہم مسائل سے تعرّض کیا جو خلافتِ راشدہ کے بعد پیش آنے والے

---

۱۵ الذہبی، ص ۹

۱۶ الخطیب، ج ۱۳، ص ۳۶۰۔ المکی، ج ۱، ص ۲۶۲

۱۷ ابن خلکان، ج ۵، ص ۴۲۳-۴۲۲۔ المکی ج ۲، ۲۱۲۔

حالات میں پیدا ہوئے تھے۔

**اُن کی آراء** اب ہم سب سے پہلے ان مسائل کو لیں گے جن کے متعلق امام کے خیالات ان کے اپنے قلم سے ثبت کیے ہوئے موجود ہیں۔ وہ کوئی صاحبِ تصنیف آدمی نہ تھے، اس لیے ان کے کام کے متعلق زیادہ تر دوسرے معتبر ذرائع ہی کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ لیکن شیعہ خوارج، مُرجِئہ اور معتزلہ کے اٹھائے ہوئے چند مسائل ایسے ہیں جن پر انہوں نے اپنی عادت کے خلاف خود قلم اٹھایا ہے اور اہل السنّت والجماعت (یعنی مسلم معاشرے کے سوادِ اعظم) کا عقیدہ و مسلک نہایت مختصر مگر واضح الفاظ میں مرتب کر دیا ہے۔ فطرۃً ہمیں ان کے کام کا جائزہ لیتے ہوئے اولیت کا مرتبہ اسی چیز کو دینا چاہیے جو ان کی اپنی تحریر کی صورت میں ہمیں ملتی ہے۔

اس سے پہلے ہم بیان کر چکے ہیں کہ حضرت علیؓ کے زمانۂ خلافت اور بنی امیہ کے آغازِ سلطنت میں مسلمانوں کے درمیان جو اختلافات رونما ہوئے تھے ان سے چار بڑے فرقے وجود میں آ گئے تھے جنہوں نے بعض ایسے مسائل پر انتہائی آراء کا نہ صرف اظہار کیا بلکہ اُن کو مذہبی عقیدہ قرار دے دیا جو مسلم سوسائٹی کی ترکیب، اسلامی ریاست کی حیثیت، اسلامی قانون کے مآخذ، اور امت کے سابقہ اجتماعی فیصلوں کی مستند حیثیت پر اثر انداز ہوتے تھے۔ ان مسائل کے متعلق سوادِ اعظم کا مسلک اگرچہ متعین تھا، کیونکہ عام مسلمان اس پر چل رہے تھے، اور بڑے بڑے فقہاء وقتاً فوقتاً اپنے اقوال و افعال سے بھی اس کا اظہار کرتے تھے، لیکن امام ابوحنیفہ کے وقت تک کسی نے اس کو دو ٹوک طریقے سے ایک واضح تحریر کی صورت میں مرتب نہیں کیا تھا۔

**عقیدۂ اہل سنت کی توضیح** امام ابوحنیفہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے "الفقہ الاکبر"[۱] لکھ کر ان مذہبی

---

۱؎ "علمِ کلام" کی اصطلاح رائج ہونے سے پہلے عقائد اور اصولِ دین اور قانون، سب کے لیے "فقہ" کا لفظ ہی استعمال ہوتا تھا۔ البتہ فرق اس طرح کیا جاتا تھا کہ عقائد اور اصولِ دین کو "الفقہ الاکبر" کہتے تھے۔ امام ابوحنیفہ

فرقوں کے مقابلہ میں عقیدۂ اہل السنت والجماعت کو ثبت کیا۔ اس میں ہمارے موضوع سے متعلق جن سوالات سے امام نے بحث کی ہے ان میں پہلا سوال خلفاء راشدین کی پوزیشن کا ہے۔ مذہبی فرقوں نے یہ بحث اٹھادی تھی کہ آیا ان میں سے بعض کی خلافت صحیح تھی یا نہیں، اور ان میں سے کون کس پر افضل تھا، بلکہ ان میں سے کوئی مسلمان بھی رہا یا نہیں۔ ان سوالات کی حیثیت محض چند سابق شخصیتوں کے متعلق ایک تاریخی رائے کی نہیں تھی، بلکہ دراصل ان سے یہ بنیادی سوال پیدا ہوتا تھا کہ جس طرح یہ خلفاء مسلمانوں کے امام بنائے گئے آیا اس کو اسلامی ریاست کے سربراہ کی تقرری کا آئینی طریقہ مانا جائے گا یا نہیں۔ نیز اگر ان میں سے کسی کی خلافت کو بھی مشکوک سمجھ لیا جائے تو اس سے یہ سوال پیدا ہو جاتا تھا کہ اُس کے زمانے کے اجماعی فیصلے قانونِ اسلام کا جز مانے جائیں گے یا نہیں، اور اس خلیفہ کے اپنے فیصلے قانونی نظائر کی حیثیت رکھیں گے یا نہیں۔ اس کے علاوہ ان کی خلافت کی صحت و عدمِ صحت اور ان کے ایمان و عدم ایمان، حتیٰ کہ ان میں سے بعض پر بعض کی فضیلت کا سوال بھی آپ سے آپ اس سوال پر منتہی ہوتا تھا کہ بعد کے مسلمان آیا اُس ابتدائی اسلامی معاشرے پر اعتماد رکھتے ہیں اور اس کے اجتماعی فیصلوں کو تسلیم کرتے ہیں یا نہیں جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی براہِ راست تربیت و رہنمائی میں بنا تھا اور جس کے توسط ہی سے بعد کی نسلوں کو قرآن اور سنتِ پیغمبر اور اسلامی احکام کی ساری معلومات پہنچی ہیں۔

دوسرا سوال جماعت صحابہ کی پوزیشن کا ہے جس کے سواد اعظم کو ایک گروہ اس بنا پر

---

نے یہی نام اپنے اس رسالے کے لیے استعمال کیا۔ اس کتاب کے بعض حصوں کے متعلق قریب کے زمانے میں محققین نے شک ظاہر کیا ہے کہ وہ الحاقی ہیں۔ لیکن ہم یہاں اس کے جن اجزاء سے بحث کر رہے ہیں ان کی صحت مسلّم ہے۔ کیونکہ دوسرے جن ذرائع سے بھی ان مسائل کے متعلق امام ابوحنیفہ کا مسلک معلوم ہوتا ہے یہ ان سے مطابقت رکھتے ہیں۔ مثلاً ابوحنیفہ کی الوصیہ، ابو مطیع البلخی کی روایت کردہ الفقہ الاکبر، اور عقیدۂ طحاویہ جس میں امام طحاوی (۲۳۹ - ۳۲۱ھ - ۸۵۳ - ۹۳۳ء) نے ابوحنیفہ اور ان کے دونوں شاگردوں ابویوسف اور محمد بن حسن الشیبانی سے منقول شدہ عقائد بیان کیے ہیں۔

ظالم وگمراہ بلکہ کافر تک کہتا تھا کہ انہوں نے پہلے تین خلفاء کو امام بنایا، اور جس کے افراد کی ایک بڑی تعداد کو خوارج اور معتزلہ کافر و فاسق ٹھیراتے تھے۔ یہ سوال بھی بعد کے زمانے میں محض ایک تاریخی سوال کی حیثیت نہ رکھتا تھا، بلکہ اس سے خود بخود یہ مسئلہ پیدا ہو جاتا تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو احکام ان لوگوں کے واسطے سے منقول ہوتے ہیں وہ آیا اسلامی قانون کے ماخذ قرار پائیں گے یا نہیں۔

تیسرا اہم اور بنیادی سوال ایمان کی تعریف، ایمان و کفر کے اصولی فرق، اور گناہ کے اثرات و نتائج کا تھا جس پر خوارج، معتزلہ اور مرجیہ کے درمیان سخت بحثیں اٹھی ہوئی تھیں۔ یہ سوال بھی محض دینیاتی نہ تھا بلکہ مسلم سوسائٹی کی ترکیب سے اس کا گہرا تعلق تھا، کیونکہ اس کے متعلق جو فیصلہ بھی کیا جائے اس کا اثر مسلمانوں کے اجتماعی حقوق اور ان کے قانونی تعلقات پر لازماً پڑتا ہے نیز ایک اسلامی ریاست میں اس سے یہ مسئلہ بھی پیدا ہو جاتا ہے کہ گناہ گار حاکموں کی حکومت میں جمعہ و جماعت جیسے مذہبی کام اور عدالتوں کے قیام اور جنگ و جہاد جیسے سیاسی کام صحیح طور پر کیے جا سکیں گے یا نہیں۔

امام ابوحنیفہ نے ان مسائل کے متعلق اہل السنت کا جو مسلک ثبت کیا ہے وہ حسب ذیل ہے:

خلفائے راشدین کے بارے میں: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد افضل الناس ابوبکر صدیق ہیں، پھر عمر بن الخطاب، پھر عثمان بن عفان، پھر علی بن ابی طالب۔ یہ سب حق پر تھے اور حق کے ساتھ رہے۔"[۹]

عقیدۂ طحاویہ میں اس کی مزید تشریح اس طرح کی گئی ہے:

"ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو تمام امت پر

---

۹؎ ملا علی قاری، شرح الفقہ الاکبر، ص ۷۴ - ۷۶، طبع مجتبائی، دہلی، ۱۳۴۸ھ۔ المغنیساوی، شرح الفقہ الاکبر، ص ۲۵، ۲۶، دائرۃ المعارف، حیدرآباد، ۱۳۲۱۔

افضل قرار دیتے ہوئے سب سے پہلے خلافت ان کے لیے ثابت کرتے ہیں، پھر عمر بن الخطاب کے لیے، پھر عثمان کے لیے، پھر علی بن ابی طالب کے لیے، اور یہ خلفاء راشدین وائمۂ مہدیین ہیں۔"[120]

اِس سلسلہ میں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ امام ابوحنیفہ ذاتی طور پر حضرت علیؓ کو حضرت عثمانؓ کی بہ نسبت زیادہ محبوب رکھتے تھے[121] اور ان کی شخصی رائے یہ بھی تھی کہ ان دونوں بزرگوں میں سے کسی کو کسی پر فضیلت نہیں دی جا سکتی،[122] مگر حضرت عثمانؓ کے انتخاب کے موقع پر اکثریت سے جو فیصلہ ہو چکا تھا اس کو تسلیم کرتے ہوئے انہوں نے اجتماعی عقیدہ یہی قرار دیا کہ فضیلت کی ترتیب بھی وہی ہے جو خلافت کی ترتیب ہے۔ (باقی)

---

۱۲۰ ابن ابی العز الحنفی، شرح الطحاویہ ص ۴۰۳-۴۱۶ - دار المعارف، مصر ۱۳۷۳ھ۔

۱۲۱ الکردری، مناقب الامام الاعظم، ج ۲، ص ۷۲، طبع اول ۱۳۲۱ھ، حیدر آباد۔

۱۲۲ ابن عبد البر، الانتقاء، ص ۱۶۳، المکتبۃ القدسی قاہرہ، ۱۳۵۰ھ۔ السرخسی، شرح السیر الکبیر، ج ۱، ص ۱۵۰-۱۵۱، مطبعۃ مصر شرکۃ مساھمۃ مصریہ، ۱۹۵۷ء۔ اور یہی رائے امام مالک اور یحیٰی بن سعید القطان کی بھی تھی: ابن عبد البر، الاستیعاب، ج ۲، ص ۴۶۷۔

# ترکی میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ

خلیل حامدی

زیرِ نظر مضمون ترکی کے موجودہ حالات کو سمجھنے کی ایک کوشش ہے لیکن ہم اصل موضوع پر اظہارِ خیال کرنے سے قبل یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ ترک قوم کو اپنے تشکر و امتنان کا بصمیمِ قلب خراج پیش کریں۔ ترکی کے عوام، ترکی کے حکمران، ترکی کے اپوزیشن رہنما، سب نے بحیثیتِ مجموعی ہماری آزمائش پر جس تڑپ اور قلق کا اظہار کیا ہے وہ لاریب اُس کے گہرے ملّی شعور، مضبوط قومی اخلاق، اور لازوال عشقِ اسلام کا آئینہ دار ہے۔ ہمارے اور ترک قوم کے درمیان قُرب و مؤدّت کے رشتے پہلے بھی کم مضبوط نہ تھے مگر اب یہ تعلق ایسی یگانگت میں تبدیل ہو گیا ہے جس سے دونوں ملکوں کی تاریخ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ مصیبت کی گھڑی میں کسی کی مدد کو لپکنا اگر مصیبت زدہ کے نقطۂ نظر سے غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے تو خود مددگار کے نقطۂ نظر سے بھی دنیا و آخرت میں خیرِ کثیر کا موجب ہے۔

۱۲ اکتوبر ۱۹۶۵ء کی صبح تُرکی میں نئے خوشگوار انقلاب کی خبر لائی ہے۔ انتخابات میں عدنان مِیندریس مرحوم کی پارٹی کا نمایاں اکثریت کے ساتھ کامیاب ہونا اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ فوج اور سول سروس نے انتخابات میں بے جا مداخلت نہیں کی۔ پھر اقتدار کا پورے امن کے ساتھ جیتنے والی پارٹی کی طرف منتقل ہو جانا اس بات کی کھلی علامت ہے کہ ترکی میں جمہوری روایات جڑ پکڑ چکی ہیں اور ترکوں نے اس حقیقت کو سمجھ لیا ہے کہ خونی انقلابات اور فوجی سازشوں کے ذریعہ سے اقتدار کے اُلٹ پھیر کا راستہ ان کے لیے خطرناک ہے اور پُرامن تغیرات کا دروازہ کھلا رکھنے ہی میں ان کی خیر ہے۔ تغیر تو اللہ تعالیٰ کی ایک سنّت ہے جسے لازمًا اپنا کام کرنا ہی ہے۔ ایک

قوم کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ اس سُنّت کو اپنے ہاں اس طرح جاری کرے۔ انسانیت کے لیے جو چیز انفع ہے اُسے پنپنے کا موقع دیا جائے۔ اس سنّت سے تاریخ کے کسی مرحلے نے جب کبھی انحراف کیا ہے، اُس کا نتیجہ فلاح و ترقی سے بُعد کی صورت میں نکلا ہے۔ ترکی کا نیا تغیّر یکایک وجود پذیر نہیں ہوگیا، بلکہ اس کے لیے ۱۵ سال کی مدّت درکار ہوئی ہے۔ تغیّر کے بیج تو بہت پُرانے تھے مگر اس کی پہلی کونپل ۱۹۵۰ء میں نمودار ہوئی۔ ۱۵ سال تک تغیّر کا خمیر پکتا رہا اور بالآخر اس سال ۱۲ اکتوبر کا انتخاب اُسے فیصلہ کُن مرحلے میں لے آیا۔ تغیّر کے محرّکات میں سے سب سے بڑا محرک اسلام ہے اس لیے ہم تمام محرّکات اور اُن کے اسباب کا جائزہ لینے کے بجائے صرف اسلام کے نقطۂ نظر سے اس موضوع پر کلام کریں گے۔

عصمت انونو کی ری پبلکن پارٹی پہلی مرتبہ ۱۹۵۰ء میں زوال سے آشنا ہوئی، اور جلال بایار اور عدنان میندریس کی ڈیموکریٹک پارٹی کے عروج کا آغاز ہوا[1]۔ ۱۹۵۴ء کے انتخابات میں اس کی قوت و نفوذ میں مزید اضافہ ہوا[2] اور ۵۸ء تک ترکی پر ڈیموکریٹک گورنمنٹ حکومت کرتی رہی، جس کے صدر جلال بایار اور وزیر اعظم عدنان میندریس تھے۔ مصطفیٰ کمال پاشا اور عصمت انونو کے سخت گیر نظام اور ری پبلکن پارٹی کی بے پناہ آہنی گرفت کو جس چیز نے ہلا دیا وہ ڈیموکریٹک پارٹی (اور خاص طور پر عدنان مندریس) کے وہ وعدے تھے جو انتخابات کے موقع پر اُس نے ترکی عوام سے چند مذہبی اصلاحات بروئے کار لانے کے لیے کیے تھے۔ عرصۂ دراز کے بعد جب ترک مسلمانوں کے کانوں میں مذہب کی آواز پڑی اور وہ بھی انتخابی پلیٹ فارم سے، تو انہوں نے ہر طرح کے دباؤ کے باوجود اپنا بوجھ ڈیموکریٹک پارٹی کے پلڑے میں ڈال دیا[3]۔ اگرچہ

---

[1] ۵۰ء کے الیکشن میں ڈیموکریٹک پارٹی کو ۴۸۷ کے ایوان میں ۴۰۸ نشستیں حاصل ہوئیں۔ مقابلے میں ری پبلکن پارٹی تھی جسے شکست فاش ہوئی۔ [2] ڈیموکریٹک پارٹی کو ۵۰۰ سو اور ری پبلکن کو صرف ۲۸ نشستیں ملیں۔ اس وقت ڈیموکریٹک پارٹی کے صدر جلال بایار اور سیکرٹری عدنان مندریس مرحوم تھے۔

[3] ایک امریکی مصنف لکھتا ہے: "اسلام کے اثرات کی شدت کا یہ عالم ہے کہ لادین ترکی تک میں

برسرِ اقتدار آنے کے بعد شروع شروع میں اس پارٹی نے ان وعدوں کو زیادہ اہمیت نہیں دی اور بعض پہلوؤں سے اس نے وہی اقدامات کیے جن کا الزام وہ ری پبلکن حکومت کو دیتی رہی تھی۔ لیکن عوام کی تائید حاصل کرنے کے لیے اُسے اسلام کے حق میں بعض اچھے اقدامات کرنے پڑے جو اگرچہ محدود نوعیت کے تھے مگر پہلی حالت کے مقابلہ میں بہتر امکانات پیدا کرنے والے تھے۔ ان اقدامات کا خلاصہ یہ ہے:

ترک مسلمانوں کو تیس سال کا دَورِ جبر گزارنے کے بعد پہلی مرتبہ عربی میں اذان پڑھنے کی اجازت ملی۔ جمعہ کے روز دس منٹ کے لیے ریڈیو سے عربی میں قرآن کی تلاوت ہونے لگی۔ حج پر سے پابندیاں کم ہوئیں۔ مصطفیٰ کمال اور عصمت انونو کے عہد میں ترکی کی بڑی بڑی مساجد بالکل ویران ہوگئی تھیں، بلکہ بعض تاریخی مسجدوں کو میوزیم میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ عدنان حکومت نے ان تمام مساجد کی مدتوں کے بعد از سرِ نو مرمت کروائی۔ ۱۹۵۶ء میں مصطفیٰ کمال کے مقبرے کے سامنے ایک نئی عظیم الشان مسجد بنوائی جس کے لیے عدنان مندریس نے اپنی جیب سے ایک لاکھ دینار کا چندہ دیا۔ قرآن مجید حفظ کرنے والوں کی قدر افزائی کی گئی اور اُن کے لیے وظائف جاری ہوئے۔ مساجد کے لیے ائمہ و خطباء تیار کرنے کا اہتمام کیا گیا اور اس کے لیے دینی تعلیم کے مدارس جاری کیے گئے۔ ۱۹۵۱ء میں جب پہلی مرتبہ استنبول، انقرہ، قونیہ، اور قیصری کے شہروں میں ان مدارس کا افتتاح ہُوا تو ترک مسلمانوں کے اندر مسرّت کی لہر دوڑ گئی۔ یہ مدارس اونچے درجے کے نہ تھے مگر چونکہ حکومت کے زیرِ اہتمام ان کی داغ بیل ڈالی جارہی تھی اس لیے ترک عوام حکومت کے نقطۂ نظر میں بنیادی تبدیلی سے بے حد خوش و شادماں تھے۔ اس بنیادی تبدیلی کی اہمیت اس سے بے نقاب ہوتی ہے کہ ۱۹۲۵ء میں جب دینی مدارس کو مصطفیٰ کمال نے لپیٹ کر رکھ دیا تھا تو ان کے بارے میں

---

ہر سطح کے سیاسی رہنما دیہاتی ووٹ حاصل کرنے کے لیے مجبور ہیں کہ کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو اسلام سے ہم آہنگ اور اس کا وفادار ثابت کر دکھائیں۔" (مسلم ورلڈ اکتوبر ۱۹۵۹ء)

یہ کہا تھا کہ: "یہ برائی کے اڈے ہیں" اُس وقت ان "اڈوں" کی تعداد ۲۴۲ تھی۔ مگر جب حکومت کا یہ گھناؤنا لقب ان کو ملا تو ان پر ایسی خزاں چھائی کہ دس سال کے بعد صرف ۲۰ رہ گئے اور وہ بھی کس مپرسی کے حالم میں۔ ۱۹۵۰ میں ڈیموکریٹک حکومت نے اس لقب کو واپس لے لیا اور عوام خوشی کے مارے آپے سے باہر ہو گئے۔ علاوہ بریں سرکاری مدارس میں جہاں خالص سیکیولر تعلیم دی جاتی تھی مذہبی تعلیم کو نصاب میں شامل کیا گیا۔ ۱۹۵۰ء میں پانچویں اور چھٹے درجے میں مذہبی تعلیم کو لازمی مضمون قرار دیا گیا۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں مذہبی تعلیم کے شعبے جاری کیے گئے۔ انقرہ یونیورسٹی میں الٰہیات فیکلٹی کے نام سے ایک شعبہ قائم کیا گیا جس میں قدیم ترکی زبان کی تعلیم کا اہتمام کیا گیا تاکہ مذہبی لٹریچر کے ان ذخائر سے فائدہ اٹھایا جا سکے جن سے ترکی کی لائبریریاں بھری پڑی تھیں۔

ان تمام جزوی اصلاحات کے پیچھے بظاہر وہ وعدے تھے جو اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے نام سے ترک عوام سے کیے گئے تھے۔ ترکوں کے بے پناہ دینی جوش اور روحانی طلب نے ان وعدوں کا خیر مقدم کیا اور اس بات کی پروا نہیں کی کہ ان کے پس منظر میں کیا مقاصد مضمر ہیں۔ البتہ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ ترکی کو ۳۰-۳۵ سال مذہب سے جدا رکھنے کی جو کوشش کی گئی تھی اس کی وجہ سے ترک نوجوان اشتراکی یلغار کے سامنے ڈگمگاتے جا رہے تھے۔ ان کو اشتراکی افکار کے خلاف اکسانے اور انہیں ایک مضبوط قوتِ کردار سے بہرہ ور کرنے کے لیے مذہب کا واسطہ اختیار کیے بغیر چارہ نہ تھا۔ چنانچہ مذہب کو اشتراکیت کے انسداد کا ایک کامیاب نسخہ سمجھ کر استعمال کیا گیا۔ مگر مغرب پرست عناصر کی یہ عجیب اُلجھن سامنے آئی کہ ایک طرف تو وہ ترک نوجوانوں کے اندر مذہبی جذبات کے احیاء کی ضرورت بھی تسلیم کرتے ہیں مگر دوسری طرف مذہبی اصلاحات کے خلاف شور بھی مچاتے ہیں۔ ضرورت اس لیے محسوس کرتے ہیں کہ مذہب کے سوا کمیونزم کی روک تھام کے تمام حربے کند ثابت ہو رہے ہیں، اور چیں بجبیں اس لیے ہیں کہ ترکی اگر مسلمان بن گیا تو دنیا کے اندر اسلام کا دورِ عروج قریب سے قریب تر ہو جائے گا۔

بہر حال ان ملے جُلے مقاصد نے ترکی کے لیے مذہب کے دروازے کھول دیئے۔ ترکوں کی مذہب پسندی کی دبی ہوئی چنگاریاں شعلۂ جوالہ بن کر اُبھر آئیں۔ اور وہ تمام کوششیں نقش بر آب ثابت ہو گئیں جو ترکوں کو "جدید" بنانے اور ترکی کو یورپ کا ایک حصّہ قرار دینے کے لیے انجام دی گئی تھیں۔ پروفیسر لوئس جیسا محتاط ناقد بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ "ترکی میں اسلام کی جڑیں اس قدر گہری اُتر چکی ہیں کہ تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ بڑے سے بڑا طوفان بھی اسے اپنی جگہ سے ہلانے کی تاب نہیں رکھتا"۔

ڈیموکریٹک پارٹی اپنی چند ہلکی پُھلکی اصلاحات کے بل پر عوام کے اندر اپنا دائرہ نفوذ وسیع کرتی رہی، اور چونکہ ملک کی خالص سیکولر فضا میں اسلام کے احیاء کی دھندلی کرنیں نظر آ رہی تھیں اس لیے ترک عوام نے تمام خرابیوں کے باوجود اس پارٹی کو بہتر مستقبل کی تعمیر کے لیے ایک عارضی ذریعہ کی حیثیت سے قبول کر لیا۔ پارٹی کا غالب عنصر اسلام کے احیاء کی ضرورت محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ اسلام کا فروغ فراخدلی سے برداشت کرنے کی ہمت نہیں پا رہا تھا، اس لیے یہ جماعت مذہبی اصلاحات کے پہلو بہ پہلو مذہب کی سرگرمیوں کو دبانے کا کام بھی کرتی رہی اور مذہب کے نام پر کام کرنے والوں کو رجعت پسندی اور انقلاب دشمنی کے الزام میں جیلوں میں بھی ٹھونستی رہی۔

۱۹۵۸ء میں ڈیموکریٹک پارٹی کو تیسری مرتبہ الیکشن میں غیر معمولی کامیابی ہوئی۔ اس مرتبہ عدنان مندریس کی شخصیت میں کئی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ وہ پہلے کی نسبت زیادہ مذہب کی طرف جھک رہے تھے اور مذہبی عناصر کا ساتھ دے رہے تھے۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر نہ صرف ترکی کے ملاحدہ بوکھلا اُٹھے بلکہ بیرونی طاقتوں نے بھی بشدت تشویش و سراسیمگی کا اظہار کیا۔ خاص طور پر یہودیوں کی بین الاقوامی تحریک صیہونیت کے حلقے تدارکِ احوال کے لیے بیتاب ہو گئے۔[1]

---

[1] ترکی میں یہودیوں کی تعداد ۵۰ ہزار کے قریب ہے۔ ترکی کی معیشت اور صحافت پر ان کا بڑا اثر ہے۔ ترکی میں "دونمہ" کے نام سے ایک گروہ بھی پایا جاتا ہے۔ یہ لوگ بظاہر مسلمان ہیں۔ مگر بہ باطن یہودی ہیں۔ اسلامی

مقامی ملحد پریس اور امریکہ اور یورپ کے یہودی پریس نے عدنان مندریس کے خلاف زوردار مہم شروع کر دی جو ۲۷ مئی ۱۹٦۰ء کے فوجی انقلاب پر منتج ہوئی۔

ان دو سالوں کے اندر مذہبی اصلاحات میں جو نمایاں اضافہ ہوا اُس کا خلاصہ یہ ہے:

حج سے بڑی حد تک پابندیاں اٹھالی گئیں[1]۔ مساجد کی طرف غیر معمولی توجہ دی گئی۔ صرف استنبول میں ۵ سو میناروں سے بیک وقت اذانیں بلند ہونے لگیں۔ حکومت کی امداد سے ایک ادارہ قائم کیا گیا جس کا نام تھا "انجمن اشاعت مطبوعات قدیمہ" اور اس کا مقصد تھا قدیم ترکی رسم الخط کا احیاء اور ترکی کے قدیم اسلامی لٹریچر کی از سرِ نو اشاعت[2]۔ حکومت نے مذہبی لٹریچر کی اشاعت سے تمام پابندیاں اٹھالیں۔ چنانچہ بدیع الزماں نورسی کے رسائل، جو اتاترک کے عہد میں خلافِ قانون تھے اور مرحوم نورسی کے تلامذہ انہیں راتوں کو ہاتھوں سے لکھ لکھ کر

خلافت کے خاتمہ میں ان لوگوں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ انٹرنیشنل یہود فیڈریشن کا مرکز استنبول میں ہے۔ اسرائیل کو تسلیم کرنے میں اس عنصر کا بڑا دخل رہا ہے۔ حکومت اس پر قابو پانے کی پوری کوشش کر رہی ہے اور یہ خوشی کی بات ہے کہ مصر پر سہ طاقتی حملہ کے وقت ترکی حکومت نے اپنا سفیر اسرائیل سے واپس بُلا لیا تھا۔ اس کے بعد سے آج تک سفراء کا تبادلہ نہیں ہوا۔ اور آئندہ سب سے پہلے امکانات بھی ختم ہو گئے ہیں۔

[1] حج سے پابندیاں اٹھنے کے بعد ترکی حاجیوں کی تعداد میں سال بہ سال غیر معمولی اضافہ ہو رہا ہے۔ ۱۹۵۰ء میں جب پہلی مرتبہ ترک مسلمانوں کو ۲۵ سال کی قدغن کے بعد حج کی اجازت ملی تو ۴۲۳ افراد نے فریضۂ حج ادا کیا۔ ۱۹۵۹ء میں جب پابندیاں اور کم ہو گئیں تو حجاج کی تعداد میں حیرت انگیز اضافہ ہو گیا۔ اور اب حج ترکی میں بالکل آزاد قرار پا چکا ہے۔ چنانچہ ۱۹٦۴ء میں ترک حجاج کی تعداد ۲۱ ہزار ٦ سو ۳ تھی جو بیرونی حجاج میں دوسرے نمبر پر تھی۔ پہلے نمبر پر پاکستان کی تعداد تھی یعنی ۲٦ ہزار ۵۳۔ مگر یاد رہے کہ پاکستان کی آبادی ۱۰ کروڑ ہے اور ترکی کی ۳ کروڑ۔

[2] زمانہ کے انقلابات دیکھیے۔ ایک دن وہ تھا کہ انقرہ و استنبول کے چوراہوں میں لاطینی ترکی میں لکھے ہوئے بورڈ آویزاں تھے اور جو راہ گیران کو پڑھ نہ سکتا تھا سپاہی کی تازیانے اس کی تواضع کرتے تھے اور ایک دن یہ ہے کہ خود حکومت کی طرف سے ایسے ادارے کھولے جا رہے ہیں جو عربی رسم الخط سکھا کر ترک قوم کو اس کے سرمایۂ اسلاف سے روشناس کرائیں اور جس ماضی سے ترکی کو منقطع کر دیا گیا تھا اس سے از سر نو ربط قائم کریں۔

پھیلاتے تھے، کھلم کھلا پھیلنے لگے۔ دوسرا مذہبی لٹریچر بھی کثرت سے منظرِ عام پر آنے لگا۔ اسلامی پریس کو آزادی کا سانس نصیب ہؤا۔ انونو کے دور تک ترکی میں مذہب کے نام لیوا اخبارات و رسائل تقریباً ناپید تھے اور جو ایک آدھ پرچہ نکلتا تھا وہ بھی ہمیشہ حکومت کی غیظ آلود نگاہوں کا ہدف بنا رہتا تھا۔ مگر عدنان مندریس نے پریس کو اظہارِ خیال کی جونہی آزادی دی، ترکی کے اطراف میں ہزاروں اخبارات و رسائل نکلنے شروع ہو گئے۔ استنبول کا مقبول ترین ہفتہ وار حُرآدم (HOR ADAM)، نجیب فاضل کا ماہنامہ بیقنتوغو، اشرف ادیب کا ماہنامہ سبیل الرشاد، صالح اوزجان کی زیرِ ادارت نکلنے والا ہلال، عثمان یکسی کا پرچہ سردنگھتی اور ماہنامہ وولکان اور اس طرح کے اور لا تعداد اخبارات و رسائل فوری طور پر اسلامی محاذ کے نہایت گرمجوش اور جاں نثار سپاہی بن کر میدان میں آ گئے۔

ائمہ و خطباء کے مدارس کی تعداد بڑھا دی گئی۔ ان میں تعلیم کا معیار بھی اونچا کر کے مڈل اور سیکنڈری تعلیم کے ہم پلہ قرار دیا گیا۔ مڈل کی مدتِ تعلیم ۴ سال اور سکنڈری کی ۳ سال مقرر کی گئی۔ اور مزید خوبی یہ پیدا کی کہ ایک طرف وہ تمام مضامین شاملِ نصاب کیے گئے جو وزارتِ تعلیم کے پبلک اسکولوں اور کالجوں میں پڑھائے جاتے ہیں اور دوسری طرف اسلامی مضامین کا مکمل نصاب جاری کیا گیا[1]۔ ان مدارس کے نظام کو مضبوط تر کرنے اور ان کے لیے باصلاحیت مدرسین تیار کرنے کے لیے "ہائر اسلامک اسٹڈیز" کے نام سے ایک ٹریننگ سنٹر نومبر ۱۹۵۹ء کو استنبول میں جاری کیا گیا۔ اس سنٹر کی مدتِ تعلیم ۴ سال ہے۔ اس کی وسعت اور صلاحیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے اساتذہ میں سات استنبول یونیورسٹی کے ڈاکٹر، اور تین ازہر کے فارغ علماء ہیں۔ اور مقامی کالجوں کے پروفیسروں کی معتدبہ تعداد اس میں تدریس کے فرائض انجام دے رہی ہے۔

---

[1] ان مدارس کے اسلامی مضامین یہ ہیں: قرآن کریم، عربی زبان، تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، فلسفہ قدیم، اسلامی علم الاجتماع، اسلام کا علم النفس، تاریخ مذاہب، اسلامی تاریخ، سیرت، اخلاق، تاریخ فن اسلامی، تجوید، فارسی زبان و ادب، مغربی زبانوں میں سے انگریزی، فرانسیسی اور جرمنی میں سے کوئی ایک زبان۔

طلبہ کی تعداد ۳۰۰ سو ہے۔ اس ادارے کی طرف طلبہ کا رجحان اس قدر شدت اختیار کر گیا کہ اگلے ہی سال حکومت کو قونیہ میں بھی اسی پیمانے کا ایک اور سنٹر قائم کرنا پڑا۔ اس سنٹر کے اندر بھی اس وقت تین سو کے قریب طلبہ زیر تربیت ہیں۔ ان دونوں سنٹروں میں جدید علوم اور اسلامی علوم نہایت عمدہ پیمانے پر پڑھائے جاتے ہیں[1]۔ ان کے اغراض و مقاصد یہ ہیں: (۱) ترکی کی قدیم اسلامی ثقافت کا احیاء (۲) نوخیز نسل کی اسلامی تعلیم و تربیت اور اسلام سے اُس میں سچا لگاؤ پیدا کرنا (۳) اعلیٰ معیار کے مفتی اور مبلغ تیار کرنا (۴) پبلک کے مڈل اور سکنڈری اسکولوں کے لیے دینیات اور عربی کے مدرسین تیار کرنا۔

جس ملک پر خالص لادینی نظامِ تعلیم جبر و تشدد کے زور پر فرمانروائی کر رہا تھا اور ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک کو دین کی ہوا تک لگنے نہیں دی جا رہی تھی اُس ملک کے اندر دینی تعلیم سے یہ اعتناء عوام کے لیے بڑے خوشگوار تغیر کی خبر لا رہا تھا۔ عوام کی مُردہ امنگوں میں جان ڈال رہا تھا۔ اور قدرتی طور پر عوام کی تائید و حمایت کا رُخ بھی ان لوگوں کی طرف ہو رہا تھا جو ان اصلاحات کے علمبردار تھے۔

ڈیمو کریٹک پارٹی کا تیسری مرتبہ ۵۸ء میں کامیاب ہو جانا اور عدنان مندریس کا پورے اختیارات کے ساتھ ترکی کے اُفق پر اُبھر آنا اصلاحات کے حامیوں اور مخالفوں کے درمیان شدید کشمکش کا موجب بن گیا۔ ترکی دستور کی رُو سے طاقت کا اصل مرکز وزیرِ اعظم ہے، اس لیے عدنان مندریس مکمل اختیارات کے مالک ہو گئے تھے اور دوسری طرف عوام کی بے پناہ تائید نے انہیں بڑے سے بڑے اقدام کے لیے جری بنا دیا تھا یہی وجہ ہے کہ ۵۸ء کے بعد موصوف نے بڑے دُور رس اقدامات کر ڈالے۔ ایک طرف مذہبی اصلاحات کی رفتار تیز کر دی، جن کا مختصر سا خاکہ

[1] ان کے اسلامی مضامین یہ ہیں: قرآن کریم، تفسیر، بلاغتِ قرآن، حدیث، توحید، عربی زبان و ادب، فقہ اسلامی، اصولِ فقہ، تاریخ مذاہب اسلامیہ، موازنۂ ادیان، اسلامی تہذیب کی تاریخ، ترکی ثقافت کی تاریخ، ترکی کا اسلامی ادب، قدیم فلسفہ، جغرافیہ بلاد اسلامیہ، تاریخ انقلاب ترکی، تاریخ فنِ اسلامی، اسلام کا علم النفس، فلسفۂ اخلاق، تاریخ فلسفۂ اسلام، دعوت و تبلیغ، انگریزی، فرانسیسی اور جرمنی زبانوں میں سے کوئی ایک زبان، فارسی زبان و ادب

اوپر درج کیا گیا ہے، بلکہ اس پہلو میں انہوں نے یہاں تک جوش وخروش دکھایا کہ ایک مرتبہ انہوں نے جلسۂ عام میں اعلان کیا کہ "ترکی مسلمان ہے اور مسلمان رہے گا"۔ یہ فقرہ ترکی کے سیکولرازم پر ضرب کاری تھا۔[1] دوسری طرف انہوں نے داخلی نظام میں بھی اہم تبدیلیاں شروع کر دیں۔ اور تیسری طرف ملک کی خارجہ سیاست کو پرانی ڈگر سے ہٹانے کے منصوبے بنانے لگے، جس کا مقصد یہ تھا کہ ترکی کو ایک طرف مسلمان ملکوں سے قریب تر لایا جائے اور دوسری طرف اس کو امریکہ کے تسلط سے آزاد کروایا جائے۔[2] اسی خارجی سیاست کا ثمرہ یہ تھا کہ پاکستان کے ساتھ ترکی کے گہرے دوستانہ تعلقات کی داغ بیل عدنان مندریس ہی کے زمانے میں پڑی۔

اس کشمکش کا لاوا برابر پکتا رہا۔ مخالف عنصر نے یونیورسٹیوں کے طلبہ اور پروفیسروں کو عدنان گورنمنٹ کے خلاف بھڑکا دیا۔ اور مظاہروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان مظاہروں میں ترکی کے ساٹھ ہزار طلبہ میں سے تقریباً پانچ ہزار نے حصہ لیا۔ طلبہ کے غیظ و غضب کا فوری سبب یہ تھا کہ عدنان گورنمنٹ نے ترکی کے کثیر الاشاعت اخبار وطن کو حکومت کے خلاف اشتعال انگیزی کے الزام میں بند کر دیا تھا۔[3] اس بندش کے خلاف امریکہ اور برطانیہ کے یہودی

---

[1] ترکی کا سیکولر دستور اگرچہ عدنان مندریس کی مذہبی اصلاحات میں حائل تھا، مگر انہوں نے دستور کے بجائے اپنے اختیارات کے بھروسے پر یہ اصلاحات کر ڈالیں۔ چنانچہ ۱۹۶۰ء کے فوجی انقلاب میں اُن پر جو الزامات لگائے گئے اور جن کی بنا پر انہیں سزائے موت دی گئی ہے اُن میں سب سے بڑا الزام دستور کی خلاف ورزی تھا۔

[2] ۱۹۶۰ء کا فوجی انقلاب جس تاریخ کو برپا ہوا ہے اُس کے ایک ہفتہ بعد عدنان مندریس روس کے دورہ پر جانے والے تھے۔ امریکی حلقوں کے اندر اس دورہ کی خبر نے بڑی ہلچل مچا دی تھی۔ مگر فوجی انقلاب نے اس منصوبے کی بساط لپیٹ کر رکھ دی۔

[3] وطن اخبار کا ایڈیٹر احمد امین سلیمان ہے۔ یہ دوغلہ گروہ کا آدمی ہے۔ احمد امین کا اصل نام سالامون (SALAMON) ہے۔ اپنے پورے دورِ صحافت میں یہ ایک طرف صیہونی نظریات کی اشاعت کرتا رہا ہے اور دوسری طرف عربوں اور ترکوں کے درمیان منافرت کی آگ بھڑکاتا رہا ہے۔ ترک عوام اس سے بے حد نفرت کرتے ہیں اور اس کی حقیقت سے آگاہ ہیں۔

پیپر نے شور واویلا مچایا۔ اور خود ملک کے مخالفِ اسلام پریس نے بڑے اشتعال انگیز مضامین لکھے۔ ۲۷ مئی ۱۹۶۰ء کو فوج نے زمامِ اقتدار سنبھال لی اور عدنان مندریس اور ان کے ساتھیوں کو فوجی انقلاب کی عدالت سے موت کی سزا دے دی گئی۔ پھر ۱۹۶۱ء میں انقلاب کے سربراہ جمال گورسل نے نئے انتخابات کروائے جن میں دو پارٹیوں نے نمایاں حصہ لیا۔ ایک عصمت انونو کی ری پبلکن پارٹی اور دوسری عدنان مندریس کے حامی عناصر کی پارٹی۔ یہ پارٹی الیکشن سے کچھ عرصہ پہلے وجود میں آئی اور اس کے اندر وہ تمام عناصر مجتمع ہو گئے جو عدنان مندریس کی ڈیموکریٹک پارٹی میں شامل تھے۔ اس پارٹی کا نام "عدالت پارٹی" ہے۔ دونوں کی کامیابی کا تناسب تقریباً برابر تھا اور کوئی ایک پارٹی بھی واضح اکثریت حاصل نہ کر سکی۔ خاصی تگ و دو اور گفت و شنید کے بعد پیپلز ری پبلکن پارٹی اور عدالت پارٹی مخلوط حکومت بنانے پر رضامند ہو گئیں۔ مخلوط حکومت بنانے میں عدالت پارٹی کے اس عنصر کا تعاون تھا جو وقتی مشکل کو حل کرنے کے لیے عصمت انونو سے مصالحت کے لیے تیار ہو گیا لیکن یہ سطحی حل کامیاب ثابت نہ ہو سکا۔ انتشار میں کوئی کمی نہ ہوئی اور پایانِ کار جون ۶۲ء کو مخلوط حکومت کو مستعفی ہونا پڑا۔ صدر جمال گورسل نے دوبارہ عصمت انونو کو ہی کابینہ مرتب کرنے کی دعوت دی۔ اگر ہم صاف گوئی سے کام لیں تو یہ عرض کرنا پڑے گا کہ محترم عصمت انونو نے برسرِ اقتدار آتے ہی مذہب کے معاملے میں وہی رویہ اختیار کیا جس کے وہ برسوں سے علمبردار ہیں اور جس کی ناکامی اور مضرت کا خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر چکے ہیں[1]۔ چنانچہ فروری ۶۴ء میں عصمت انونو کی حکومت بجٹ پر رائے شماری کے موقع پر شکست کھا گئی[2] اور

---

[1] ہم اپنی اصولی تنقید کے لحاظ سے آں محترم کے بارے میں اس صاف گوئی پر مجبور ہوتے ہیں۔ ورنہ انہیں پاکستان سے جو تعلق ہے اُس کا ہمیں پورا پورا احساس ہے اور ہم اُن کی اس تائید و حمایت کے بے حد شکر گزار ہیں جو اپوزیشن کی طرف سے انہوں نے پاکستان کے حق میں کی ہے اور جس میں انہوں نے کہا ہے کہ "ہم پاکستان کے ہر دکھ سکھ میں شریک ہیں"۔

[2] اس شکست کا فوری سبب یہ تھا کہ قبرص میں صدر مکاریوس، ایوکا تحریک کے غنڈوں اور یونانی باشندوں کے ہاتھوں ترک آبادی کا قتلِ عام ہو رہا تھا، عورتوں کی عصمتیں لٹ رہی تھیں، بچوں کی بوٹیاں اڑ

عدالت پارٹی نے دوسری تین پارٹیوں (نیو ترکش پارٹی۔ جمہوریہ ملت پارٹی۔ پیپلز پارٹی) کے تعاون سے ایک مخلوط حکومت تشکیل کی۔ مگر اب اکتوبر ۶۵ء کے عام انتخابات میں عدالت پارٹی اتنی واضح اکثریت سے کامیاب ہوگئی ہے کہ اس نے یک جماعتی حکومت بنا لی ہے۔ ان انتخابات میں عدالت پارٹی نے ۲۵۹ ری پبلکن نے ۱۲۷ نشستیں حاصل کی ہیں۔ اور یہ بات خاص طور پر قابلِ غور ہے کہ اس انتخاب میں جناب عصمت انونو کو ۴۰ اور ۵۰ کے درمیان ووٹ ملے ہیں۔

عدالت پارٹی نے فروری ۶۴ء میں دوسری پارٹیوں کے تعاون سے جب حکومت بنائی تھی اُس وقت مغربی پریس نے پھر خطرے کی گھنٹی بجادی تھی کہ ترکی کے اندر اسلام بڑا فروغ پارہا ہے۔ سوئٹزرلینڈ کے شہر زیورچ کے کثیر الاشاعت روزنامہ ٹیگیس اینزیگر (TAGES ANZEIGER) نے جو جرمنی زبان میں نکلتا ہے[1]، ۵ اگست ۱۹۶۴ کی اشاعت میں لکھا:

"استنبول کے ۵ سو میناروں سے ہم از سر نو پانچ وقت کی اذانیں عربی زبان میں سُن رہے ہیں۔ عربی زبان اسلام کے نبی کی زبان ہے۔ یہ زبان مغرب پسند اتاترک کے عہد میں انتہائی ممنوع تھی۔ اتاترک نے روزمرہ کی زندگی میں عربی کا استعمال ناجائز قرار دے دیا تھا۔ چند ہفتوں کی بات ہے کہ یہ اذانیں بڑی طاقت کے لاؤڈ اسپیکروں سے بلند کی جارہی ہیں[2]۔ اس سے مؤذن کی آواز دس گنا قوی ہو جاتی ہے۔ پو پھٹتے ہی مؤذن

رہی تھیں، گاؤں کے گاؤں نذرِ آتش کیے جارہے تھے، مسجدوں اور عبادت گاہوں تک کو مسمار کیا جارہا تھا۔ ترکی کے مسلمان اس صورت حال کو برداشت نہیں کر رہے تھے اور عصمت انونو حکومت سے قبرص کے خلاف اعلانِ جنگ اور قبرصی ترکوں کی مکمل کھلا حمایت کا مطالبہ کر رہے تھے۔ مگر انونو حکومت نے امن کو جنگ پر ترجیح دی۔ اور عوام کے جذبات کی کوئی پروا نہ کی۔ چنانچہ بجٹ سیشن کے پہلے ہی اجلاس میں اُسے حکومت سے ہاتھ دھونے پڑے۔

[1] سوئٹزرلینڈ کی سرکاری زبان جرمن ہے۔

[2] چند ہفتوں سے مراد یہ ہے کہ جب سے عدالت پارٹی برسرِ اقتدار آئی ہے۔

کی آواز پردۂ شب کو اس شدت سے چاک کر دیتی ہے کہ استنبول میں نووارد شخص ہڑبڑا کر نیند سے بیدار ہو جاتا ہے۔ یہ منظر ترکی کے موجودہ سیاسی رجحانات کے ساتھ، جو قریب کے عرصہ سے سرزمین ہلال میں صاف محسوس ہونے لگے ہیں، ہم آہنگ ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تو ممکن تھا کہ آپ کمال پسند گروہ اور کمالی نظریہ کے وکلاء کی زبان سے یہ سُن لیتے کہ مذہبی اتحاد کی اساس پر استوار ہونے والے معاہدوں کی اِس دور میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن اب پچھلے چند سالوں سے مذہب ترکی کے اندر اوّلین درجہ حاصل کرنے کا راستہ اختیار کر چکا ہے۔ اب کوئی چیز مذہب کو منزلِ مقصود تک پہنچنے سے نہیں روک سکتی"۔

اس سے دو ماہ قبل فرانس کے ایک روزنامے "ٹریبیون ڈی جنیوا" (TRIBUNE DE GENEVE) میں روزنامے کے مشہور سیاسی تبصرہ نگار جان جاکس چوشیٹ (JEAN JAGUESCHCHOUET) نے ایک طویل مقالہ[1] میں لکھا:

"اتاترک نے ترکی کو سیکولر اسٹیٹ بنانا چاہا، اور ترکی کو اسلام کے پنجے سے" جس نے عثمانی سلاطین کو اپنا اقتدار قائم کرنے کی قوت فراہم کی تھی، نکال لینا چاہا۔ اتاترک اسلام کو رکیک فلسفۂ الٰہیات اور بد اخلاق گاؤدی کا ذوق اور متعفن اور باسی وہم سمجھتا تھا[2] جس نے زندگی کو زہر آلود بنا دیا تھا۔ اتاترک کا یہ انقلاب بڑا بنیادی اور جوہری تھا۔ مجرد جمہوری نظام کی تاسیس کی نسبت انقلاب کو عوام سے منوانے کا بھی کامیاب نسخہ تھا۔ سلطنت کی تنسیخ نومبر ۱۹۲۲ء کو ہو گئی تھی البتہ خلافت کا خاتمہ ۳ مارچ ۱۹۲۴ء کو ہوا۔ مصطفیٰ کمال نے تو قرآنی تعلیمات کے اثرات شخصی زندگی سے محو کرنے کے لیے صرف سیکولر تعلیم اور سیکولر کلچر کے فروغ پر توجہ دی مگر عصمت انونو نے اپنے اقتدار کے پہلے

---

[1] ملاحظہ ہو شمارہ ۲۹ جون ۱۹۶۴ء

[2] نقل کفر کفر نباشد۔ یہ گھناؤنا الزام ہم صرف قارئین کو مطلع کرنے کے لیے نقل کر رہے ہیں ورنہ مقالہ نگار کی اسلام دشمنی اور مشرق بیزاری کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں ہے۔

۴۲ سالوں کے اندر سیکولرازم کو صحیح معنوں میں دین کے استیصال کے لیے استعمال کیا لیکن اسلام ان سب کوششوں کے باوجود سخت جان نکلا۔ ان تمام کارروائیوں کے آگے وہ نہ جھک سکا۔ عدنان مندریس اس حقیقت کو پوری طرح سمجھ گیا تھا۔ اُس نے اقتدار کی کرسی تک پہنچنے کے لیے مذہب پر نگاہیں جمائے رکھیں۔ چنانچہ حکومت پر آتے ہی اُس نے سب سے پہلا جو فرمان جاری کیا وہ ترکی کے اندر عربی اذان کی اجازت کا تھا۔"

عدالت پارٹی کے پہلی مرتبہ برسرِ اقتدار آنے کے بعد سے ہی مغربی اخبارات نے حسب معمول واویلا مچانا شروع کر دیا ہے کہ ترکی میں اسلام سر اٹھا رہا ہے۔ یہ اخبارات دراصل ترکی کے اس خوشگوار اور روشن مستقبل سے لرزاں ہیں جو ترکی کی عدالت پارٹی یا اسی طرح کے دوسرے اسلام پسند عناصر کے ہاتھوں تعمیر ہو رہا ہے۔ جیسے جیسے ترکی میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ ہو رہی ہے ترکی ایشیائی ممالک اور خاص طور پر عرب اور مسلم ممالک سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ یہ بات بھی مغرب کے لیے سوہانِ روح بن رہی ہے۔ عربوں اور ترکوں کے تعلقات مکدر کرنے میں مغربی پریس نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی لیکن اب ان ناپاک منصوبوں کے علی الرغم عربوں اور ترکوں کے روابط تازہ ہو رہے ہیں۔ چنانچہ عدالت پارٹی کی حکومت کے دوران جنوری ۶۵ء کو انقرہ کا ایک وفد عرب ملکوں کا دورہ کر چکا ہے۔ وفد کے لیڈر ترکی سینٹ کے ممبر پروفیسر سعدی توفس تھے۔ پروفیسر موصوف نے دورہ کرتے وقت ایک بیان میں یہ کہا:

"وہ شخص ترکی کے خلاف صریح بہتان تراشی کرتا ہے جو یہ کہتا ہے کہ ترکی اسلام کے بے نظیر و محبوب وجود سے الگ ہو گیا تھا۔ ہم فرزندانِ ترکیہ ایسے ہر شخص کو چیلنج دیتے ہیں کہ وہ کوئی ایک مثال بھی ایسی پیش کرے کہ ہم نے کبھی کسی مسلمان قوم یا مسلمان ملک کے خلاف دشمنِ اسلام طاقت کی کسی حقیقی معرکہ میں مدد کی ہو۔"[1]

[1] المسلمون فروری ۶۵ء

ترکی حکومت کے موجودہ سربراہ سلیمان ڈیمرل نے وزارت تشکیل دینے کے بعد اپنی حکومت کی جو پالیسی مرتب کی ہے وہ اعتدال اور احتیاط کی مکمل آئینہ دار ہے۔ اور امید ہے کہ مرحوم عدنان مندریس اگر بعض معاملات میں عجلت پسندی اور اجتہادی غلطی کا شکار ہو گئے تھے تو موجودہ سربراہ بصیرت و ژرف نگاہی سے کام لیں گے۔ سلیمان ڈیمرل نے اپنی پہلی تقریر میں یہ واضح کر دیا ہے کہ ان کی حکومت معیشت کے میدان میں نجی کاروبار کو فروغ دے گی۔ سماجی بھلائی کے لیے مناسب اقدامات کرے گی۔ مذہب سے آزادانہ تعاون کرے گی۔ مذہبی اداروں کو مضبوط تر کرے گی۔ ملک کو ایک دینی ریاست کے رنگ میں رنگے گی۔ اور معاہدوں کی رکنیت کو برقرار رکھے گی۔ ان تمام قرائن کے پیش نظر مولانا مودودی کا یہ خیال بے جا نہیں ہے کہ عدالت پارٹی سے ہم ترکی کے اندر احیائے اسلام کی توقع رکھتے ہیں۔ عدالت پارٹی کا آرگن روزنامہ "عدالت" جس قوت اور صراحت سے اسلام کی دعوت پیش کر رہا ہے اس سے اس پارٹی کے عزائم سمجھنے میں خاص مدد ملتی ہے۔

---

# پاکستان کا مستقبل اور طلبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

[ یہ ایک تقریر ہے جو ۶ نومبر ۶۵ء کو ملتان میں اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے سالانہ جلسے کے موقع پر کی گئی تھی ]

حمد و ثنا کے بعد ——

عزیز طلبا اور محترم حاضرین، جس موضوع پر مجھے اظہار خیال کرنا ہے، اس کے متعلق کچھ کہنے سے پہلے میں اس بات پر اپنی دلی مسرت کا اظہار کرتا ہوں کہ اس ملک کے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں خدا کے فضل سے ایسے نوجوان موجود ہیں جن کے دلوں میں ایمان کی شمع روشن ہے، جو مسلمان کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں کو سمجھتے ہیں اور ہمارے تعلیمی اداروں میں اسلامی روح پھیلانے کے لیے منظم طریقے سے کوشش کر رہے ہیں۔ اگر کسی شخص کے دل میں اس ملک کی بھلائی کا جذبہ ہو تو وہ اس چیز کی قدر کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ چیز کوئی خطرہ نہیں ہے بلکہ خدا کی رحمت ہے کہ ایک غلط نظامِ تعلیم اور نظامِ تربیت کے باوجود ہماری درس گاہوں میں اس طرح کے نوجوان پائے جاتے ہیں اور ساری مزاحمتوں کے باوجود اپنے اس فرض کو سرگرمی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔

میری تقریر کے لیے جو موضوع تجویز کیا گیا ہے وہ "پاکستان کا مستقبل اور طلبہ" ہے۔ اس عنوان میں درحقیقت "اور" کا لفظ میرے نزدیک زائد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کا مستقبل طلبہ ہی ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہیں بلکہ پاکستان کا مستقبل طلبہ ہی سے وابستہ ہے۔ جو نسل اس وقت ملک کے معاملات کو چلا رہی ہے وہ اپنا کام ختم کرنے والی ہے۔ اسے عنقریب دنیا سے رخصت ہونا ہے اور اس ملک کے معاملات کو انہی نوجوانوں کے حوالے

کر کے جانا ہے جو ہماری درسگاہوں میں تیار ہو رہے ہیں۔ انہی کو تمام معاملات کا سربراہ، کارفرما اور کارکن بننا ہے۔ اور پاکستان کے مستقبل کا پورا انحصار اس پر ہے کہ ہم کیسے نوجوانوں کے حوالے اس ملک کو کر کے جا رہے ہیں۔

حضرات، اس بات کو نگاہ میں رکھیے کہ پاکستان درحقیقت اِس زمین کا نام نہیں ہے، اِس کے پہاڑوں اور دریاؤں کا نام نہیں ہے، اُن انسانوں کا نام ہے جو اس سرزمین میں رہتے ہیں۔ یہ انسان فانی ہیں، ہر ایک کو اپنی ایک عمر گزار کر رخصت ہو جانا ہے۔ اس سرزمین میں ہماری تہذیب ہماری ثقافت، ہمارا تمدن، اور ہمارا نظامِ زندگی اگر باقی رہ سکتا ہے تو صرف اسی طرح رہ سکتا ہے کہ جو میراث ہم نے اپنے اسلاف سے پائی ہے وہ آگے کی نسل کو ٹھیک ٹھیک سونپ دیں اور اُس کو اس قابل بنا کر جائیں کہ وہ اس میراث کو صحیح طریقے سے آئندہ نسلوں کے حوالے کر سکے۔ دنیا میں جو قومیں مٹی ہیں وہ اس معنی میں نہیں مٹیں کہ ان کی نسل ختم ہو گئی۔ وہ اگر مٹی ہیں تو اس لیے کہ ان کا قومی تشخّص ختم ہو گیا۔ ہم جب کہتے ہیں کہ مثلاً بابل کی قوم مٹ گئی یا فراعنۂ مصر کی قوم مٹ گئی تو وہ اس معنی میں ہوتا ہے کہ اہلِ بابل اور فراعنہ جس تہذیب کے علمبردار تھے اس کی خصوصیات مٹ گئیں اور اس کے امتیازی اوصاف ختم ہو گئے۔ اہلِ بابل کی نسل آج بھی موجود ہے مگر اُن کا تشخّص ختم ہو گیا۔ قدیم مصریوں کی نسل بھی موجود ہے مگر فرعونی اور قبطی تہذیب و ثقافت ختم ہو گئی کیونکہ ان کی نسلیں اس قابل نہ رہیں کہ بعد کی نسلوں تک اپنی قومی میراث کو ٹھیک ٹھیک منتقل کر سکتیں۔ کسی قوم کی نئی نسلیں اگر اپنا قومی تشخّص کھو دیں اور کوئی دوسرا تشخّص اختیار کر لیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ قوم ختم ہو گئی۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ بنی اسرائیل کے دس قبیلے غائب ہو گئے جن کا آج کہیں پتہ نہیں چلتا۔ یہ اس معنی میں نہیں ہے کہ ان کا قتلِ عام ہوا تھا اور ان کا بیج ہی دنیا سے مٹ گیا۔ بلکہ اس معنی میں ہے کہ ان کے اندر سے اسرائیلیت کا احساس ختم ہو گیا اور ان کی نسلوں میں اسرائیلی شعور نہ رہا۔ اسرائیلی خصوصیات اور اسرائیلی تہذیب و تمدن کے امتیازی اوصاف کھو دینے کے بعد وہ دنیا کی دوسری قوموں میں جذب ہو کر رل مل گئے اور آج خود

ان کی اولاد بھی یہ نہیں جانتی کہ ہم اسرائیلی ہیں۔ اس لیے ایک قوم کے زندہ رہنے کا سارا دارومدار اس بات پر ہے کہ وہ اپنی آئندہ نسل کو اس طرح تیار کرے جس سے وہ اس کے قومی تشخص کو برقرار رکھ سکے۔ اسی چیز کی اہمیت میں اس وقت آپ کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہوں۔

یہ زمین مسلمانوں نے اس غرض کے لیے حاصل کی تھی کہ یہاں اسلامی تہذیب جلوہ گر ہو۔ ہم جس نظامِ زندگی کے قائل ہیں اُس کو یہاں عمل میں لایا جا سکے۔ ہم جن قوانین اور جن اصولِ حیات کو صحیح سمجھتے ہیں اور ان پر ایمان رکھتے ہیں وہ اس سرزمین میں رائج ہوں۔ یہ مقصد تھا پاکستان کے بننے کا۔ مسلمان قوم جس نے یہ خطہ حاصل کیا ہے اس کے بقا کا انحصار بھی دوسری تمام قوموں کی طرح اس بات پر ہے کہ جو تہذیب، جو تمدن اور جو اصولِ حیات اسلام کے نام سے موسوم ہیں جن کو ہم نے اپنے بزرگوں سے پایا ہے، جن کی بنا پر ہم دوسروں سے الگ ایک مسلمان قوم سمجھے جاتے ہیں، یہ صحیح طریقے سے آئندہ نسلوں تک پہنچیں۔ آئندہ نسلیں اسی رنگ میں رنگی جائیں اور ان کو ہم انہی اصولوں کے مطابق تیار کر کے جائیں تاکہ اس پاکستان میں مسلمان قوم زندہ رہ سکے۔ مسلمان افراد زندہ نہیں رہ سکتے لیکن مسلمان قوم صدہا برس تک زندہ رہ سکتی ہے بشرطیکہ وہ اس قابل ہو کہ اس تہذیبی میراث کو منتقل کر سکے اور نسل در نسل اس کے منتقل ہونے کا سلسلہ چلتا رہے۔ اگر ہم ان امتیازی خصوصیات کو باقی نہ رکھ سکیں اور ہماری نئی نسلیں اسلامی تہذیب کے بجائے، مثلاً امریکی تہذیب میں رنگی جائیں تو آئندہ یہ پاکستان نہ ہوگا بلکہ امریکستان ہوگا۔ ہماری نسلیں موجود رہیں گی مگر امریکیت کے رنگ میں رنگی ہوئی ہوں گی۔ وہ اسلامی تہذیب کا بقا نہیں ہوگا جس کے لیے یہ پاکستان حاصل کیا گیا تھا بلکہ وہ ایک دوسری تہذیب کا بقا ہوگا اور اس سے ہمارا قومی تشخص بدل جائے گا۔ اس چیز سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ طلبہ کا مسئلہ حقیقت میں کیا ہے اور وہ کتنی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ محض تعلیم کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ ہمارے قومی وجود اور اس کے بقا کا مسئلہ ہے۔ ہم یہاں ایک مسلمان قوم کی حیثیت سے اسی طرح زندہ اور باقی رہ سکتے ہیں کہ ہماری نوجوان نسل جو درسگاہوں میں تیار ہو رہی ہے وہ ٹھیک اسلامی

تہذیب کی حامل ہو اور اس کی علمبردار بن کر اس سرزمین میں رہے۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کی دو ہی شکلیں ہیں۔ ایک یہ کہ طلباء خود اس کے لیے کوشش کریں۔ اور دوسرے یہ کہ حکومت ملک کے نظامِ تعلیم و تربیت کو ایسا بنائے جس سے یہ مقصد حاصل ہو۔ میں ان دونوں چیزوں کو الگ الگ بیان کروں گا۔

جو طلباء ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھ رہے ہیں وہ خدا کے فضل سے بالغ ہیں، سمجھ بوجھ رکھتے ہیں اور ان میں اپنے بُرے بھلے کو پہچاننے کی صلاحیت پیدا ہو چکی ہے جو علم بھی وہ حاصل کر رہے ہیں وہ کم از کم انہیں اس قابل تو ضرور بنا تا ہے کہ اگر وہ اپنے آپ کو سمجھنا چاہیں تو سمجھ سکتے ہیں اور اپنا راستہ خود بنا سکتے ہیں۔ اس وجہ سے تمام تر انحصار بالکل حکومت ہی کی کوششوں پر نہیں ہے بلکہ خود طلبہ کی اپنی کوششوں پر بھی ہے۔ ہمارے نوجوان طلبہ کو خود یہ احساس ہونا چاہیے کہ وہ مسلمان ہیں اور انہیں اس سرزمین میں ایک مسلمان قوم کی حیثیت سے رہنا ہے۔ ان کے اندر خود یہ خواہش ہونی چاہیے کہ وہ مسلمان قوم کی اُن امتیازی خصوصیات کو سمجھیں اور برقرار رکھیں جنہیں کھو دینے کے بعد اس کا قومی تشخص قائم نہیں رہ سکتا۔

اسلام کا سارا دارومدار توحید کے عقیدے، رسالت کے عقیدے اور آخرت کے عقیدے پر ہے۔ ہر شخص کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ ان تین چیزوں میں شک پیدا ہو جانے کے بعد کوئی شخص اسلامی تہذیب کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل نہیں ہو سکتا۔ ہر وہ چیز جو ان عقائد میں شک پیدا کرتی ہے درحقیقت وہ اسلامی تہذیب کی اور بالآخر خود پاکستان کی جڑ کاٹ دینے والی ہے۔ پاکستان زندہ نہ رہے گا اگر اس میں اسلامی تہذیب باقی نہ ہو، اور اسلامی تہذیب باقی نہیں رہ سکتی اگر اس میں توحید، رسالت اور آخرت کے عقیدے بنیاد کے طور پر موجود نہ ہوں۔

سب سے زیادہ جس چیز کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے جن نوجوانوں میں کوئی اسلامی شعور موجود ہے وہ اپنی درسگاہوں میں الحاد و دہریت اور

تشکیک پیدا کرنے والی ہر تحریک کا مقابلہ کریں۔ کسی ایسی تحریک کو پنپنے نہ دیں جو ان بنیادی عقیدوں سے منحرف کرنے والی ہو۔ جس طریقے سے بھی ممکن ہو ایسی ہر تحریک کا مقابلہ کرنا پاکستان کو زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ قریب کے زمانے میں جو حالات اس ملک میں پیش آئے ہیں ان سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ایمان کے بغیر پاکستان ایک مملکت اور پاکستانی ایک قوم کی حیثیت سے زندہ ہی نہیں رہ سکتے۔ اگر یہ قوم خدانخواستہ خدا، رسول اور آخرت کے تصور سے باغی اور منحرف ہو جائے تو اس کا ایک آزاد اور باعزت قوم کی حیثیت سے باقی رہنا ہی سرے سے ممکن نہیں ہے۔ جو زبردست چیلنج ابھی پچھلے دنوں پاکستان کو پیش آیا اُس سے اگر پاکستان بخیریت نکلا ہے تو صرف ایمان کی طاقت سے نکلا ہے۔ ہمارے فوجیوں نے اگر قربانیاں دی ہیں تو اس یقین کی بنیاد پر دی ہیں کہ خدا ہمارے ساتھ ہے، اس یقین کی بنا پر دی ہیں کہ کوئی آخرت کی زندگی ہے، اس عقیدے کی بنا پر دی ہیں کہ شہادت کی موت مرنے والے کے لیے ابدی زندگی میں جنت الفردوس ہے۔ اگر ان کے اندر شہادت کا یہ تصور موجود نہ ہوتا، اگر ان میں اسلام کی محبت نہ ہوتی اور اسلام کے لیے کٹ مرنے کا جذبہ نہ ہوتا تو وہ قربانیاں کبھی نہیں دی جا سکتی تھیں جو ابھی پاکستان کی سرحدوں پر دی گئیں اور اگر وہ قربانیاں نہ دی جاتیں تو آج ہم یہاں خیریت سے موجود نہ ہوتے۔ اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ پاکستان کے بقا کی ضامن اگر کوئی چیز ہے تو وہ خدا کی توحید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور آخرت کی زندگی پر یقین ہے۔ اگر کوئی شخص ان تین چیزوں کے بارے میں لوگوں کے دلوں میں شک پیدا کرتا ہے تو وہ صرف ایک کفر ہی کا ارتکاب نہیں کرتا، صرف ایک ارتداد کا ہی ارتکاب نہیں کرتا، بلکہ حقیقت میں وہ پاکستان کے ساتھ غداری کرتا ہے اور اس مملکت کی جڑ کاٹتا ہے۔ اس احساس کو اچھی طرح دلوں میں جاگزیں کر لیجیے۔ اگر آج تک اس معاملے میں کوئی کوتاہی ہوئی ہے تو آئندہ نہ ہونی چاہیے۔ ہمارے ملک کی کسی درسگاہ میں، کسی کالج، کسی یونیورسٹی اور کسی مدرسے میں بھی اب ملحدانہ نظریات و افکار کو ہرگز نہ پھیلنے دیا جائے اور

کسی ایسے فلسفے کو جڑ نہ پکڑنے دی جائے جو اسلام کے بنیادی عقائد میں شک پیدا کرنے والا ہو۔

دوسری اہم چیز جس کی طرف ہمارے نوجوان طلبہ کو متوجہ ہونا چاہیے وہ یہ ہے کہ ہماری بقا کا انحصار جس طرح اسلام کے عقیدے پر ہے اسی طرح اسلامی اخلاق پر بھی ہے۔ عقیدے اور اخلاق میں ایک گہرا تعلق ہے۔ یہ ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسلامی عقیدہ ہی ہم سے چند خاص اخلاقیات کا تقاضا کرتا ہے۔ ہماری درسگاہوں میں ایک مدتِ دراز سے اخلاق کے معاملہ میں شدید غفلت ہی نہیں برتی جا رہی ہے بلکہ ایک ایسی ثقافت کو پرورش کیا جا رہا ہے جو اسلام کے تمام تصورات کی اور اس کے تمام بنیادی اخلاقی نظریات کی ضد ہے۔ ہمیں یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اخلاق جن کے بل پر کوئی مغربی قوم اٹھ سکتی ہے ہم اس کے بل پر نہیں اٹھ سکتے۔ ہم اگر اٹھ سکتے ہیں تو اُن اخلاقی نظریات کی بنیاد پر اُٹھ سکتے ہیں جو اسلام نے ہم کو دیئے ہیں۔ مغرب کا ایک آدمی ناچ گا کر، شراب پی کر، اور فواحش کا ارتکاب کر کے بھی اپنے ملک کے لیے قربانی دینے کھڑا ہو سکتا ہے کیونکہ جن مادی فلسفوں پر اس کے اخلاق کی تعمیر ہوئی ہے۔ یہ چیزیں اُن کی ضد نہیں ہیں لیکن ایک مسلمان جس کو خوب اچھی طرح معلوم ہے کہ ان چیزوں کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا ہے وہ جب اس ثقافت کو اختیار کرتا ہے اور اس طرزِ زندگی کی پیروی کرتا ہے تو وہ حقیقت میں اسلام کی بنیادی تعلیمات سے مُنہ موڑ کر ایسا کرتا ہے۔ ایک مغربی آدمی یہ کام کر کے اپنے اخلاقی اصولوں سے منہ نہیں موڑتا لیکن ہم اس تہذیب کو اختیار کرتے ہیں تو اُن تمام اصولوں کو توڑ ڈالتے ہیں جن پر ہمارے اخلاق کی بنیاد قائم ہے۔ ایک مسلمان اگر شراب پیتا ہے تو اس کی حیثیت ایک مغربی کے شراب پینے سے بہت مختلف ہے۔ اگرچہ شراب کے جسمانی اور نفسانی نقصانات سب انسانوں کے لیے یکساں ہیں خواہ پینے والا مسلمان ہو یا کافر لیکن ایک کافر کے دین میں چونکہ شراب حرام نہیں ہے اس لیے وہ جب اس کو استعمال کرتا ہے تو صرف ایک مضر چیز کا استعمال کرتا ہے، اپنے عقیدے پر لات نہیں مارتا۔ اس کے برعکس ایک مسلمان اس حرام فعل کا ارتکاب اس

وقت تک نہیں کرسکتا جب تک اس کے اندر خدا اور رسول سے بغاوت اور آخرت سے بے پروائی کا جذبہ پرورش نہ پاچکا ہو۔ اور اس کے بعد معاملہ صرف ایک حرمت کے توڑنے پر نہیں رکتا بلکہ پھر وہ تمام حرمتیں توڑتا اور اخلاقی بندشیں کاٹتا چلا جاتا ہے۔ پھر تو کوئی چیز اس کے لیے ایسی مقدس نہیں رہ جاتی جسے پامال کردینے سے وہ باز رہ جائے۔ اس سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ ایک غیر اسلامی تہذیب اگر ایک مسلمان قوم کے اندر رواج پاجائے تو اس کے نقصانات اُس سے بدرجہا زیادہ ہیں جو کسی غیر مسلم قوم میں اُس تہذیب کے رواج پانے سے ہوسکتے ہیں۔ غیر مسلم پر اس تہذیب کے بُرے اثرات صرف اُس حد تک ہوتے ہیں جتنے ہر غلط چیز کے اثرات کسی شخص یا قوم پر ہُوا کرتے ہیں۔ لیکن ہم اگر کسی فاسقانہ تہذیب کو اختیار کرتے ہیں تو اس کے ساتھ ہمارے ایمان پر بھی زد پڑتی ہے۔ اس سے ہمارے ایمان کی جڑیں کمزور ہوتی ہیں۔ ہمارے اندر خدا اور رسول کی اطاعت کے بجائے بغاوت پیدا ہوتی ہے۔ اور اس بغاوت کے بعد یہ ممکن نہیں رہتا کہ ہم دنیا میں کسی وفاداری پر اور کسی نظم کی اطاعت پر قائم رہ سکیں کیونکہ سب سے بڑھ کر جس کی وفاداری و اطاعت ہم پر لازم تھی اس سے ہم پہلے ہی بغاوت کرچکے ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے جب کوئی مسلمان ایک مرتبہ اسلامی احکام کی نافرمانی پر اُتر آتا ہے تو وہ ایک نافرمانی پر بس نہیں کرتا بلکہ نافرمانیاں کرتا ہی چلا جاتا ہے یہاں تک کہ اس کے اندر کوئی احساسِ فرض باقی نہیں رہتا، کسی قانون کا احترام باقی نہیں رہتا، کسی حد پر جاکر اس کی اخلاقی گراوٹ نہیں رکتی۔ آپ اندازہ کیجیے کہ جب ایک شخص خدا کو خدا اور رسول کو خدا کا رسول اور قرآن کو خدا کی کتاب ماننے کے باوجود کسی ایسے فعل کا ارتکاب کرتا ہے جس کے متعلق وہ جانتا ہے کہ خدا نے اس سے منع کیا ہے، رسول نے اس کی مذمت کی ہے، قرآن نے اسے حرام کیا ہے اور آخرت کے عذاب کی وعید سنائی ہے، تو اس کے بعد آخر کیا چیز اسے کسی اخلاقی قدر کا احترام ملحوظ رکھنے پر آمادہ کرسکتی ہے؟ کسی لیجسلیچر کے قانون کا وہ کیسے پابند رہ سکتا ہے جسے وہ خدا نہیں مانتا؟ کسی قوم یا ملک کے لیے وہ اپنی ذات اور اپنی خواہشات کو کیسے قربان کرسکتا ہے جسے وہ معبود نہیں سمجھتا؟

اس کے اندر تو مقدس ترین چیزوں تک کی بے احترامی پیدا ہو چکی ہے۔ اس کو تو قانون شکنی کا مرض لگ چکا ہے، اور اپنے ایمان کی رو سے وہ بلند ترین قانون کو توڑ چکا ہے۔ یہ قانون شکنی کسی حد پر جا کر نہ رُکے گی بلکہ وہ مستقل طور پر قانون کی بے احترامی کے مرض میں مبتلا ہو جائے گا۔ اس کے بعد توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ کسی معاملہ میں بھی کسی قانون کا پابند رہے گا۔ ایسا شخص تو کسی مہذب سوسائٹی کا رکن بننے کے قابل بھی نہیں رہتا کجا کہ وہ ایک مسلم سوسائٹی کا رکن رہے۔

اس چیز کو اگر کوئی شخص اچھی طرح سمجھ لے تو وہ یہ محسوس کرے گا کہ جو لوگ ہماری درسگاہوں میں ہمارے نوجوانوں کو عیاش بنا رہے ہیں، ان کو طاؤس و رباب کا شیفتہ بنا رہے ہیں، غیر اسلامی ثقافت کو ان میں رواج دے رہے ہیں، اور اسلامی اخلاق کی بندشوں کو توڑ ڈالنے کی بیماری انہیں لگا رہے ہیں وہ کتنے بڑے جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں اور کتنی بڑی بدخواہی اس ملک کے ساتھ کر رہے ہیں۔ ہمارے نوجوان طلبہ کو خود اس کے نقصانات محسوس کرنے چاہییں۔ اگر ملک کا انتظام چلانے والے اپنی نادانی سے یہ غلطی کر رہے ہیں تو طلبہ کا یہ کام ہے کہ وہ خود اس سے بچیں اور اپنے آپ کو جہاں تک ہو سکے اس سے محفوظ رکھیں۔ انہیں اپنی درسگاہوں میں ایسی رائے عام پیدا کرنی چاہیے کہ طلبہ اس غلط تہذیب کو نہ خود اختیار کریں نہ اپنی سوسائٹی اور اپنی درسگاہوں میں اسے رواج پانے دیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر خود طلبہ ہی کے اندر ایسی عام رائے پیدا ہو جائے اور وہ خود اس چیز کے مخالف ہو جائیں تو وہ کون سی طاقت ہے جو ان درسگاہوں میں زبردستی اس ثقافت کو رواج دے سکے۔ ظاہر بات ہے کہ آپ کو پولیس کے ذریعے سے نچوایا نہیں جا سکتا۔ کوئی قانون بنا کر آپ کو غیر اسلامی ثقافت اپنانے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ صرف ایک شیطانی ترغیب ہی تو ہے جس سے لوگوں کو لاسہ لگایا جا رہا ہے اور ان کی عادتیں بگاڑنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ طلبہ اگر یہ محسوس کر لیں کہ یہ ایک بیماری ہے جو انہیں لگائی جا رہی ہے تو وہ خود اس سے بچنے کی کوشش کر سکتے ہیں اور اپنی درسگاہوں میں اس طرح کی خرابیوں کے رواج پانے کی مزاحمت کر سکتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ طلبہ میں یہ عام رائے پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔

یہ دو باتیں تو وہ ہیں جن کے متعلق میں سمجھتا ہوں کہ یہ خود طلبہ کے اپنے کرنے کی ہیں اور اگر وہ اس کے اوپر عمل کریں تو بہت بڑی حد تک ان خرابیوں کو دُور کر سکتے ہیں جو اس وقت ہماری درسگاہوں میں پھیل رہی ہیں۔

اس کے ساتھ ہمارے نوجوان طلبہ کو اس بات کی طرف بھی توجہ کرنی چاہیے کہ ان کو دینِ اسلام سے واقف کرانے کے معاملے میں جو کچھ بھی کوتاہی ہمارے نظامِ تعلیم میں کی گئی ہے اس کی تلافی وہ اپنی کوششوں سے کریں۔ میں بعد میں عرض کروں گا کہ حکومت کو اس معاملہ میں کیا کرنا چاہیے۔ لیکن فرض کیجیے کہ حکومت اس طرف توجہ نہیں کرتی تو دینِ اسلام کو جاننے کا جو فرض خود آپ پر شخصی حیثیت سے عائد ہوتا ہے وہ ساقط نہیں ہو جاتا۔ ہر بالغ مسلمان کو جس کے اندر شعور پیدا ہو چکا ہو اور جو خود اپنے اختیار سے کام کرنے کے قابل ہو چکا ہو اس کا فرض ہے کہ جس اسلام کا وہ قائل ہے اور جس اسلام کی نسبت سے وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے اس کو جاننے کی آپ ہی کوشش کرے۔ یہ علم حاصل کرنے کے لیے کچھ بہت زیادہ دینی تعلیم کی ضرورت نہیں ہے۔ دین کا کم سے کم خلاصہ تو آسانی کے ساتھ آدمی کو اپنی ذرا سی کوشش سے حاصل ہو سکتا ہے۔ آپ کی اپنی زبان میں جو اسلامی لٹریچر موجود ہے اسی کا مطالعہ کیجیے اور کم از کم اتنا جان لیجیے کہ کافر اور مسلمان میں کیا فرق ہے، کیا بنیادی چیزیں ہیں جن سے ایک آدمی کافر سے مسلمان ہوتا ہے، ایک مسلمان کو کن چیزوں پر ایمان لانا چاہیے، اس کے فرائض کیا ہیں، اس کے لیے ممنوع کیا چیزیں ہیں، اس کے لیے اخلاق کے کیا اصول ہیں جن کی اسے پابندی کرنی چاہیے، اس کے لیے زندگی بسر کرنے کے کیا طریقے اسلام نے مقرر کیے ہیں جن کی اس کو پیروی کرنی چاہیے۔ یہ ایسی چیزیں نہیں ہیں جن کے لیے کسی دینی درسگاہ میں ہی آپ کا جانا اور برسوں علومِ دینی پڑھنا ضروری ہو۔ تھوڑی سی توجہ اور تھوڑی سی محنت سے ہمارا ہر نوجوان اسلام کا کم از کم اتنا علم تو حاصل کر ہی سکتا ہے اور اس علم کے لیے اردو زبان میں کافی مواد موجود ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہمارے نوجوان خود اس علم کی ضرورت محسوس کریں اور اسے حاصل کرنے کی فکر کریں۔ یہ علم آپ کو امتحان پاس کرنے اور ڈگری لینے کے لیے نہیں بلکہ مسلمان بننے کے لیے درکار ہے۔

اب میں مختصر طور پر یہ عرض کروں گا کہ حکومت پر اس سلسلے میں کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ جیسا کہ میں نے ابھی آپ سے عرض کیا قریب کے زمانے میں جو عظیم الشان چیلنج ہمیں ہندوستان سے ملا تھا اور خدا کے فضل سے جس کا جواب دینے میں پاکستان کامیاب ہوا ہے اس نے یہ بات بالکل

کالشمس فی النہار ثابت کر دی ہے کہ پاکستان کی بقا اسلام پر منحصر ہے۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان اگر کوئی رشتہ ہے تو وہ اسلام ہے۔ ملک کو بچانے کے لیے مسلمانوں کو سرفروشی پر اگر کوئی طاقت آمادہ کر سکتی ہے تو وہ اسلام کی طاقت ہے۔ ہم اگر دشمن کے خطرے سے بچے ہیں تو وہ اسلام کی بدولت بچے ہیں۔ اسلام ہی کے عقیدے نے ہمیں یہ قوت بخشی کہ پانچ چھ گنی زیادہ بڑی طاقت کے مقابلے میں لڑ کر کامیاب ہوں۔ اسلامی اخلاق کا جو بچا کھچا سرمایہ مسلمانوں کے اندر موجود تھا وہی ہمارے کام آیا۔ اگرچہ اس کا محفوظ رہ جانا فی الواقع اللہ تعالیٰ ہی کا معجزہ ہے ورنہ پچھلے ۱۸ سالوں میں اس سرمائے کو برباد کرنے کی کوششوں میں کوئی کمی نہیں اٹھا رکھی گئی تھی۔ کم از کم اس تجربے کے بعد اب ہمارے ملک کے کارفرماؤں کی آنکھیں کھل جانی چاہییں۔ ان کو سوچنا چاہیے کہ ہم اپنے ملک کے نظامِ تعلیم میں کیا اصلاحات کریں جس سے اس ملک کی نوجوان نسل سچی مسلمان بن کر اٹھ سکے اور اس قابل ہو سکے کہ آئندہ اگر کوئی اس سے بڑا خطرہ بھی پیش آئے تو اس کے مقابلے میں لوہے کی دیوار بن کر کھڑی ہو جائے۔ تجربے سے بڑھ کر سبق سکھانے والی کوئی چیز نہیں ہے۔ پہلے ہم دلائل سے اس بات کو سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے اور سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ لیکن اب تجربے نے جو بات واضح کر دی ہے اس کے بعد تو پوری سنجیدگی سے اس چیز کا جائزہ لیا جانا چاہیے کہ ہمارے نظامِ تعلیم میں کیا نقائص ہیں اور انہیں کس طرح دُور کیا جا سکتا ہے۔

ہماری حکومت کو اس بات پر بھی غور کرنا چاہیے کہ ہمارے ملک میں اتنے بڑے پیمانے پر جو بدعنوانی (CORRUPTION) پھیلی ہوئی ہے اس کی وجہ کیا ہے؟ کیا اسباب ہیں جن سے تمام کوششوں، تمام قوانین اور انٹی کرپشن (ANTI-CORRUPTION) کے محکمے کے باوجود کرپشن گھٹنے کے بجائے بڑھ رہا ہے۔ اس کرپشن نے ہمارے پورے قانونی نظام کو بے کار کر کے رکھ دیا ہے۔ جو قانون بھی کسی بُرائی کی اصلاح کے لیے نافذ کیا جاتا ہے اس کو محض قانون کے نافذ کرنے والوں کی بد دیانتی اور رشوت خوری عملاً نہ صرف معطل کر دیتی ہے، بلکہ قانون کی ہر پابندی رشوت کا ایک نیا دروازہ کھول دیتی ہے۔ مگر یہ معاملہ صرف اسی حد تک نقصان پہنچا کر نہیں رہ جاتا۔ اسی کرپشن کی

بدولت ہمارے ملک کا غلہ ہمارے دشمنوں کو ہزاروں ٹن کی مقدار میں پہنچ رہا ہے۔ ابھی حال ہی میں بھارت کے جن علاقوں پر پاکستان کی فوجوں نے قبضہ کیا ہے وہاں غلے کی ہزاروں بوریاں پائی گئی ہیں جو پاکستان سے گئی ہوئی تھیں۔ اس طرح یہ کرپشن ہمارے دشمنوں کو ہمارے خرچ پر پال رہا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر آپ سوچیں تو اس بات کا اندازہ خود کر سکتے ہیں کہ ایک آدمی اگر اپنے ملک میں اپنے بھائیوں سے سو روپے لے کر بے ایمانی کر سکتا ہے تو آخر دشمنوں سے دس ہزار روپے لے کر ہمارا کوئی راز ان کے ہاتھ کیوں نہیں بیچ سکتا۔ جب ایک قوم میں ضمیر فروشی اور بددیانتی کی وبا پھیل جائے اور اس میں ہزاروں افراد ایسے موجود ہوں جو ذاتی مفاد پر قوم، ملک، دین، ایمان ہر چیز کو قربان کر سکتے ہوں تو جس طرح ان کو خود اپنے ملک کے بگڑے ہوئے لوگ استعمال کر سکتے ہیں اسی طرح باہر کے دشمن بھی استعمال کر سکتے ہیں۔

اب ذرا دیکھیے کہ اس کرپشن کی جڑ میں کیا چیز کام کر رہی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اس ملک میں یہ جتنی بددیانتی اور رشوت خوری اور خیانت ہو رہی ہے اس کے مرتکب ہمارے تعلیم یافتہ لوگ ہی تو ہیں۔ ملک کے سارے نظامِ حکومت اور معاشی نظام کو وہی تو چلا رہے ہیں، دیہات کے ان پڑھ تو نہیں چلا رہے ہیں۔ اور یہ لوگ ہماری انہی درسگاہوں سے نکلے ہوئے ہیں۔ یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ کوئی نقص ہمارے نظامِ تعلیم میں ضرور ایسا ہے جس کی وجہ سے وہ ہمارے اندر اس قدر کثیر تعداد میں بددیانت افراد تیار کر رہا ہے۔ اگر جائزہ لیا جائے تو صاف طور پر معلوم ہو جائے گا کہ ہمارے نظامِ تعلیم میں جو نقائص ہیں ان میں سب سے بڑا بنیادی نقص یہ ہے کہ جن ایمانیات اور جن عقائد پر ہماری تہذیب اور ہمارے اخلاق کی ساری بنیاد قائم ہے یہ تعلیم ان کو تقویت پہنچانے کے بجائے اُلٹا ان کو کمزور کرتی ہے، ان میں شک پیدا کرتی ہے، اور بعض لوگوں کو انکار کے مقام تک پہنچا دیتی ہے۔ بہت ہی کم لوگ ایسے ہیں جو اپنے یقین کی جڑیں ڈھیلی کیے بغیر اس تعلیم سے فارغ ہو کر بخیریت نکل آتے ہوں۔ اب یہ سوچنے کی بات ہے کہ جب خدا اور آخرت اور رسالت ہی کے بارے میں ہمارے تعلیم یافتہ لوگوں کی اکثریت کے

یقین و اعتقاد کو گھن لگ چکا ہو تو ہمارے پاس اور کون سی چیز ایسی ہے جس کا انجکشن دے کر ہم انہیں اخلاق کے اصولوں پر قائم رکھ سکیں ؟ جس شخص کو نہ خدا کا خوف رد کرنے والا ہو نہ آخرت کی باز پرس کا احساس اس کے لیے مانع ہو اسے بد دیانتی اور خیانت اور فرض ناشناس بننے سے آخر کیا چیز روک سکتی ہے ؟ جس شخص کے اندر اپنی ذات سے بالاتر کسی چیز کی وفاداری باقی نہ رہی ہو اسے آپ کس طرح ذاتی مفاد کی قربانی پر آمادہ کر سکتے ہیں ؟ قربانی کے لیے کوئی نہ کوئی بالاتر وفاداری تو بہرحال ضروری ہے اور ایک مسلمان کے لیے اگر کوئی بنیادی وفاداری ہے تو وہ صرف خدا اور رسول اور ملت اسلام کی وفاداری ہی ہے۔ اس وفاداری کو آپ کمزور کر دیں گے تو لوگوں کے اندر لامحالہ خود غرضی اور نفسانیت ہی پیدا ہو گی اور وہ اپنی ذات کے مفاد اور اپنی خواہشات پر کسی چیز کو قربان کر دینے میں تامل نہ کریں گے۔ آپ صرف اس وفاداری کو مستحکم کر کے ہی اپنے افراد میں یہ صلاحیت پیدا کر سکتے ہیں کہ وہ حق اور انصاف اور راستی پر قائم رہیں، محض خدا کے خوف اور آخرت کی جوابدہی کے احساس کی بنا پر ایسے ناجائز فائدے اٹھانے سے رک جائیں جن کا کوئی نقصان انہیں اس دنیا میں پہنچتا نظر نہ آتا ہو، اور محض خدا اور اس کے دین کی وفاداری کی بنا پر ہر وہ قربانی کر گزریں جو بظاہر ان کی اپنی دنیا برباد کرتی نظر آتی ہو۔ دنیا کی دوسری قوموں کے لیے کچھ دوسری وفاداریاں اور کچھ دوسری قدریں ہیں جن پر ان کے اخلاق کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ ان وفاداریوں اور قدروں کو آپ اپنی قوم میں پیدا کرنا چاہیں تو آپ کو ۵۰ برس اس قوم کو غیر مسلم بنانے اور کم از کم ۵۰ ہی برس انہیں ایک اچھا فرنگی بنانے میں لگیں گے تب کہیں جا کر آپ یہاں کوئی قومی کیریکٹر پیدا کر سکیں گے بشرطیکہ اس وقت تک یہ ملک باقی رہ جائے لیکن اسلام کی بنیاد پر لوگوں کے اخلاق بنانے کا کام آپ آج ہی سے شروع کر سکتے ہیں اور چند سال کے اندر یہ کام اپنے بہترین پھل دے سکتا ہے، کیونکہ خدا اور رسول اور آخرت کے عقائد تو مسلمان نوجوانوں کو بہرحال ان کے ماں باپ سے ملے ہیں اور مسلم معاشرے کی آب و ہوا میں اور مسلمانوں کی قومی روایات میں وہ رچے بسے ہوئے ہیں۔ یہ جڑیں جو پہلے سے اس سرزمین

ہیں موجود ہیں ان کو اگر آپ ذرا سا پانی بھی دیں تو یہ فوراً ہری ہو جائیں گی اور پھل دینے لگیں گی۔
انگریزوں کو چونکہ ہماری تہذیب اور ہمارے اخلاق سے کوئی دلچسپی نہ تھی، بلکہ وہ ہمارے مسلمان ہونے کو اُلٹا خطرناک سمجھتے تھے، اس لیے انہوں نے یہاں ایسا نظامِ تعلیم قائم کیا جو ہمارے ایمان کو کمزور کرنے والا، ہمارے عقائد کو کم از کم مشکوک بنا دینے والا، اور ہماری نگاہوں سے خود اپنی تہذیب کو گرا دینے والا تھا۔ ان کا سیاسی مفاد ہی اس بات کا متقاضی تھا کہ وہ ہمیں اسلام سے جس حد تک منحرف کر سکتے ہوں، کریں لیکن اب پاکستان بننے کے بعد اور خود اپنی ایک آزاد مملکت ہاتھ میں لینے کے بعد بھی اگر ہم اُسی نظامِ تعلیم کو جاری رکھیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم دراصل خودکشی کر رہے ہیں۔

ہماری درسگاہوں میں آج ایسے استاد موجود ہیں جو دن رات طلبہ کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کرتے ہیں۔ شب و روز ان کے دلوں میں یہ عقیدہ بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اسلام کی کوئی تہذیب نہیں ہے۔ اسلام کا کوئی تمدن نہیں ہے۔ اسلام کے کوئی سیاسی اصول نہیں ہیں۔ اسلام کے معاشی اصول اگر کچھ ہیں بھی تو وہ اِس زمانے میں نہیں چل سکتے۔ اسلام کے قوانین بالکل دقیانوسی ہیں جو اس ترقی یافتہ دور کے لیے کسی طرح موزوں نہیں۔ تاریخ میں مسلمانوں کا کوئی قابلِ فخر کارنامہ نہیں ہے۔ جتنے بھی ہیرو دنیا میں گزرے ہیں سب غیر مسلم تھے۔ جتنے بھی علوم و فنون کے امام اور مجدد گزرے ہیں وہ سب بھی غیر مسلم ہی تھے۔ میں صاف کہتا ہوں کہ جو اُستاد ہماری درسگاہوں میں ہمارے نوجوانوں کو یہ سبق پڑھا رہے ہیں اور ان کے دماغوں میں یہ فاسد خیالات بھر رہے ہیں ان سے بڑھ کر اس ملک کا غدار کوئی نہیں۔ یہ اس ملک کی جڑوں پر کلہاڑا چلانے والے لوگ ہیں اور بدقسمت ہے وہ قوم جس کی نئی نسل اس طرح کے استادوں کی تعلیم سے پروان چڑھ رہی ہو۔ اس پر مزید غضب یہ ہے کہ ہمارے ہاں ایم اے ڈی اور سوشیالوجی کی تعلیم کا پورا شعبہ امریکن یا امریکہ زدہ استادوں کے حوالے کر دیا گیا ہے جو بڑے پیمانے پر تعلیم اور معاشرت کے متعلق ہماری نئی نسل کے نظریات کو پوری طرح مسخ کر دینے کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ یہ آخر خودکشی نہیں تو اور کیا ہے؟

ہماری حکومت کو اب اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ اس نظامِ تعلیم میں جو نقائص ہیں ان کو

ہم کیسے دُور کریں۔ ہمارے ہاں جو علوم و فنون پڑھائے جا رہے ہیں ان کے اندر بجائے خود کوئی نقص نہیں ہے اصل خرابی یہ ہے کہ انہیں ایسے لوگوں نے مرتب کیا ہے جو خدا کے ماننے والے نہیں ہیں اور ایسے طریقے سے مرتب کیا ہے جس سے خود بخود لوگوں کے ذہن میں ایک بے خدا کائنات کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ تصور پیدا کرتے ہیں کہ یہ سارے کا سارا نظامِ کائنات آپ سے آپ بن گیا اور آپ سے آپ چل رہا ہے۔ کوئی خدا اس کا بنانے والا اور اس کو چلانے والا نہیں ہے۔ اسی طرح دوسرا تصور جس پر ان علوم کی ترتیب اور ان کے بیان کی بنا رکھی گئی ہے وہ یہ ہے کہ انسان آپ ہی اپنا رہنما ہے، کسی خدا کی رہنمائی کی نہ اس کو حاجت ہے اور نہ وہ رہنمائی کسی خدا کے پاس سے آتی ہے۔ یہ دونوں تصور ہماری تہذیب کی جڑ کاٹ دینے والے ہیں ہمیں کوشش یہ کرنی چاہیے کہ علوم کی ترتیب و بیان کے اس اسلوب کو بدل کر انہیں خدا پرستی کی بنیاد پر مرتب اور بیان کریں۔ ہمیں سائنس اور فلسفہ اور عمرانیات کے سارے علوم کو پڑھنا ہے، ان کی ہر شاخ کو پڑھنا ہے اور ان تمام معلومات سے فائدہ اٹھانا ہے جو انسان کو آج تک حاصل ہوئی ہیں۔ لیکن اگر ہم مسلمان کی حیثیت سے زندہ رہنا چاہتے ہیں تو ہمیں ان تمام علوم کو مسلمان بنا کر پڑھنا ہوگا، ورنہ ہم چاہیں یا نہ چاہیں، موجودہ ترتیب و بیان کے ساتھ یہ علوم ہمیں نامسلمان بنا کر رہیں گے۔ یہ ہے ہماری تعلیم کا اصل مسئلہ۔ اس کو ہم جتنی جلدی سمجھ جائیں اتنا ہی ہمارے لیے بہتر ہے۔

بہت سے لوگ اس خیال کو سن کر بڑے پریشان ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سائنس کا آخر اسلام سے کیا تعلق۔ حالانکہ ان کی آنکھوں کے سامنے روس کی مثال موجود ہے جو سوویٹ سائنس کا قائل ہے۔ آپ بتایئے سائنس کا اگر اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے تو مارکسزم سے کیا تعلق ہے ؟ کوئی کمیونسٹ اپنے اشتراکی معاشرے کے افراد کو بورژوا سائنس اور بورژوا فلسفہ و تاریخ اور معاشیات و سیاسیات وغیرہ پڑھانا پسند نہیں کرتا بلکہ ان سب علوم کو مارکسزم کے رنگ میں رنگ کر پڑھاتا ہے تاکہ اشتراکی سائنس دان اور اشتراکی ماہرینِ علوم پیدا ہوں۔ بورژوا نقطۂ نظر سے مرتب کیے ہوئے علوم کو پڑھا کر کوئی اشتراکی معاشرہ پنپ نہیں سکتا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جس کی بھی کوئی اپنی تہذیب ہو، جس کا بھی اپنا کوئی نظریۂ حیات ہو، وہ اپنے نظریۂ حیات کے مخالف لوگوں کے مرتب کردہ سائنس اور

علوم و فنون اپنی نوجوان نسلوں کو پڑھانا پسند نہیں کر سکتا کیونکہ اس کے پڑھانے کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے تشخص کو ختم کر دے اور دوسروں میں جذب ہو جائے۔

یہ کہنا کہ سائنس تو ایک عالمگیر چیز ہے، اس کا کسی مذہب سے کوئی تعلق نہیں فی الواقع بڑی نافہمی کی بات ہے۔ سائنس میں ایک چیز تو ہیں وہ حقائق (FACTS) اور قوانینِ فطرت (NATURAL LAWS) جو تجربے اور مشاہدے سے انسان کے علم میں آتے ہیں۔ یہ بلاشبہ عالمگیر ہیں۔ دوسری چیز ہے وہ ذہن جو اُن حقائق اور معلومات کو مرتب کر کے اُن پر نظریات قائم کرتا ہے، اور وہ زبان جس میں وہ اُن کو بیان کرتا ہے۔ یہ چیز عالمگیر نہیں ہے، بلکہ اس میں ہر تہذیب کے پیرؤوں کا اسلوب الگ الگ ہے اور فطرتاً الگ ہونا چاہیے۔ ہم اسی دوسری چیز کو بدلنا چاہتے ہیں نہ کہ پہلی چیز کو۔

مثال کے طور پر دیکھیے۔ یہ ایک سائنٹیفک حقیقت ہے کہ دنیا کی تمام دوسری چیزیں تو سرد ہو کر سکڑتی چلی جاتی ہیں، مگر ان کے برعکس پانی جب سرد ہوتے ہوتے جمنے کے قریب پہنچتا ہے تو پھیل جاتا ہے اور برف بن کر ہلکا ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے برف سطحِ آب پر تیرنے لگتی ہے۔ یہ ایک امرِ واقعہ (FACT) ہے۔ اب ایک شخص اس چیز کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ پانی کی یہ خاصیت ہے اور وہ اتفاقاً ایسا ہوا کرتا ہے۔ دوسرا شخص اسی واقعہ کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ خدا نے اپنی حکمت و ربوبیت سے پانی میں یہ خاصیت اس لیے رکھی ہے کہ دریاؤں اور تالابوں اور سمندروں میں جاندار مخلوق باقی رہ سکے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو پانی جم جم کر نیچے بیٹھتا چلا جاتا یہاں تک کہ پورے پورے سمندر اور تالاب اور دریا برف بن جاتے اور کوئی جاندار مخلوق ان میں زندہ نہ رہتی دیکھیے ایک ہی امرِ واقعہ کو دو شخص اپنے اپنے طرزِ فکر کے مطابق دو مختلف طریقوں سے بیان کرتے ہیں اور ہر ایک کا بیان پڑھنے سے آدمی کے ذہن پر دو مختلف اثرات مترتب ہوتے ہیں۔ ایک طریقہ سے اسی واقعی حقیقت کو بیان کیا جائے تو وہ پڑھنے والے کے ذہن میں خدا کی توحید اور اس کی حکمت اور ربوبیت کا عقیدہ بٹھائے گا۔ اور دوسرے طریقے سے یہی واقعہ بیان کیا جائے، جس طرح موجودہ سائنس میں اس کو بیان کیا جاتا ہے، تو کسی شخص کے ذہن میں سرے سے خدا کا تصور آتا ہی نہیں بلکہ

اس سے آدمی کے سامنے تصویر یہ آتی ہے کہ یہ سب کچھ آپ سے آپ ہو رہا ہے، کسی صانع حکیم کی حکمت اور کسی ربِ قدیر کی پروردگاری اس میں کارفرما نہیں ہے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایک طریقے سے اگر سائنس کو پڑھایا جائے تو اس سے ایک مادہ پرست سائنس دان تیار ہوگا اور دوسرے طریقے سے وہی سائنس پڑھایا جائے تو ایک مسلمان سائنس دان تیار ہو جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ سائنس کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جو انسانوں کے دل میں ایمان کو گہری جڑوں سے راسخ کر دینے والا نہ ہو۔ فزکس، کیمسٹری، بیالوجی، فزیالوجی، اناٹومی، اسٹرانومی، غرض جس علم کو بھی آپ دیکھیں اس میں ایسے ایسے حقائق سامنے آتے ہیں جو انسان کو پکا اور سچا مومن بنا دینے کے لیے کافی ہیں سائنس کے حقائق سے بڑھ کر آدمی کے دل میں ایمان پیدا کرنے والی کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔ یہی تو وہ آیاتِ الٰہی ہیں جن کی طرف قرآن بار بار توجہ دلاتا ہے۔ مگر صرف اس وجہ سے کہ کافر سائنسدانوں نے ان حقائق کو اپنے نقطۂ نظر سے مرتب اور بیان کیا ہے، انہیں پڑھ کر آدمی الٹا مادہ پرست اور ملحد بنتا ہے اور خدا کے تصور پر ہنستا اور اس کا مذاق اڑاتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہماری حکومت اس فرق کو سمجھے اور اس معاملے کی کنہ تک پہنچنے کی کوشش کرے۔ ہم بے خدا سائنس اور بے خدا فلسفہ اور اجتماعی علوم پڑھا کر خدا پرست انسان تیار نہیں کر سکتے۔ ہمیں اگر ایک مسلمان قوم کی حیثیت سے زندہ رہنا ہے تو جلدی سے جلدی ایک ایسا ادارہ قائم کرنا چاہیے جو تمام علوم و فنون کی ترتیب کو بدلے اور ایسی نصابی کتابیں تیار کرے جن میں ان تمام علوم و فنون کو اسلامی نقطۂ نظر سے مرتب کیا جائے جب تک یہ کام نہیں کیا جائیگا میں کہتا ہوں کہ ہمارا دین و ایمان ہی نہیں خود پاکستان کا وجود بھی مستقل خطرے میں ہے۔

دوسری چیز جس کی طرف میں حکومت کو توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ اخلاقی تربیت کا مسئلہ ہے۔ یہ تربیت اگرچہ تمام ہی تعلیمی اداروں میں درکار ہے، مگر خاص طور پر مختلف سرکاری ملازمتوں کے لیے آدمی تیار کرنے والے اداروں میں تو اس کی شدید ضرورت ہے، خواہ وہ فوج کی ٹریننگ کے ادارے ہوں یا پولیس کی ٹریننگ کے یا سول سروس کی ٹریننگ کے۔ ان تمام اداروں میں اسلامی اخلاق اور اسلامی تعلیم کو لازم کیا جائے۔ اسلامی عقائد کو ذہن نشین کرایا جائے، اسلامی احکام کی پابندی کی عادت ڈالی جائے، اور کسی قسم کے فسق و فجور

کو راہ پانے کا موقع نہ دیا جائے۔ یہی وہ چیز ہے جو پاکستان کو مستحکم کرے گی۔ ہم ایک پولیس مین کو ٹریننگ دینا شروع کرتے ہیں اور اپنی جگہ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ جب اس کا نام عبداللہ یا عبدالرحمٰن ہے تو وہ مسلمان تو ہوگا ہی، اس لیے ہمیں اس کو صرف پولیس ڈیوٹی کے لیے تیار کرنا ہے، اسے مسلمان بنانے کے لیے کسی کوشش کی ضرورت نہیں ہے۔ دنیا میں ایک پولیس مین کو تربیت دینے کے لیے جو کچھ کیا جاتا ہے بس وہی کچھ ہم بھی اپنی پولیس ٹریننگ کے نظام میں کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب وہ وہاں سے تربیت پاکر نکلتا ہے تو وہ پولیس ڈیوٹی ادا کرنے کے لیے تو بخوبی تیار ہو جاتا ہے مگر اس کے اندر اسلامی اخلاق موجود نہیں ہوتے الا یہ کہ اللہ نے اس پر فضل کیا ہو اور اس کے اندر ہماری اس غفلت کے باوجود اسلامی اخلاق کے وہ اثرات باقی رہ گئے ہوں جو وہ ہماری ٹریننگ سے نہیں بلکہ کہیں اور سے لے آیا ہے۔ اس کے بعد اگر ہماری پولیس میں کوئی کرپشن ہو، اس کی سرپرستی میں جرائم پروان چڑھیں اور اس کے زیر سایہ سمگلنگ ہوتا ہے، تو پھر شکایت نہ کیجیے کیونکہ آپ نے ایسی کوشش ہی نہیں کی جس سے ہماری پولیس اسلامی اخلاق و کردار کی حامل ہو۔ ہمارے ہاں مختلف ملازمتوں کی ٹریننگ کا جو نظام ہے، اس میں اور کسی کافر قوم کی ٹریننگ کے نظام میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ جب لوگ وہاں سے نکلتے ہیں اور بڑے عہدوں تک پہنچتے ہیں تو سوائے ان لوگوں کے جن میں اسلامی اخلاق، اسلامی کردار اور اسلامی سیرت کسی دوسرے ذریعہ سے آگئی ہے، وہ اچھے مسلمان افسر ثابت نہیں ہوتے۔

جہاں تک فوجوں کی تربیت کا تعلق ہے، حال کے تجربہ نے بلاشبہ یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہماری فوجوں کی تربیت بہترین ہے اور انکی ٹریننگ دنیا کی کسی بہتر سے بہتر فوج سے کم درجے کی نہیں ہے مگر میں پوچھتا ہوں کہ جس زبردست جذبۂ جہاد اور شوقِ شہادت اور مجاہدانہ سرفروشی کا ان سے ظہور ہوا ہے اس کا سرچشمہ ہماری فوجی تربیت میں کس جگہ ہے؟ اس کا سرچشمہ وہ مسلمان مائیں ہیں جنہوں نے ان کے کانوں میں خدا ورسول کا نام ڈالا تھا۔ اس کا سرچشمہ وہ مسلم معاشرہ ہے جس کی بچی کھچی روایات نے ان کے دل و دماغ میں خدا، رسول، آخرت، جہاد اور شہادت کے تصورات بٹھا رکھے تھے اور اسلام کی محبت کا بیج بو رکھا تھا۔ مگر یہ چیز

ہماری تربیت کے نظام میں شامل نہیں تھی۔ یہ اللہ کا فضل تھا کہ ہمارے معاشرے میں اسلامی تعلیمات کے وہ اثرات موجود تھے جو اس آڑے وقت میں ہمارے کام آگئے۔ لیکن اگر ہم مسلسل اس معاشرے کو بھی بگاڑتے رہے تو یہ اثرات بھی آخر کب تک چلیں گے۔ آئندہ نسلوں کو یہ چیز کم سے کم تر ہی ملتی چلی جائیگی۔ ہماری درسگاہوں میں جو خواتین تیار ہو رہی ہیں ان کی گودوں سے پرورش پاکر نکلنے والے نوجوانوں میں ان اثرات کے باقی رہ جانے کی کم ہی امید کی جاسکتی ہے۔ یہ اثرات تو انہی لوگوں میں پائے گئے ہیں جنہوں نے اپنے گھروں میں اپنی ماؤں کو نماز پڑھتے دیکھا تھا جنہوں نے ان سے خدا اور رسول کا نام سنا تھا جنہوں نے انہیں قرآن پڑھتے دیکھا تھا۔ مگر جو نئی مائیں اب تیار ہو رہی ہیں ان کے ہاں تو فلم ایکٹرسوں کا ذکر ہوتا ہے، نئی آنے والی فلموں پر تبصرے ہوتے ہیں کھیل تماشوں کی گفتگو ہوتی ہے، مگر خدا اور رسول کا نام مشکل ہی سے ان کی زبانوں پر کبھی آتا ہے۔ ان کی گودوں سے جو نوجوان پرورش پاکر نکلیں گے کیا ان سے آپ توقع کرتے ہیں کہ پھر وہ خدا اور رسول کے نام پر جانیں دیں گے اور ان کے اندر شہادت کے وہ تصورات ہوں گے جو اب اس وقت ہمارے نوجوانوں کے اندر پائے گئے، جن کی وجہ سے انہوں نے یہ شاندار قربانیاں دیں؟ اگر ہم فی الواقع اس ملک کے لیے اور اس ملک کے نظامِ زندگی کے لیے کٹ مرنے والے نوجوان تیار کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کی فوجی تربیت کے ساتھ اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کی اسلامی تربیت دینے کی فکر بھی کرنی چاہیے جو دلوں میں ایمان کو گہرا بٹھا دے اور ان عقائد اور اخلاقیات کو نشوونما دے جن کی طاقت سے وہ آئندہ اس سے بھی زیادہ قربانیاں دینے کے قابل ہوں۔ یہی وہ چیز ہے جو ہمیں اپنے سے کئی گنے زیادہ بڑے دشمن کے مقابلے میں زندہ رکھ سکتی ہے۔

یہ وہ باتیں ہیں جن پر میں چاہتا ہوں کہ حکومت اب سنجیدگی کے ساتھ غور کرے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو تخریبی نکتہ چینیاں کرتے ہیں۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں تعمیری مقصد کے لیے کہہ رہا ہوں اور پوری وضاحت کے ساتھ بتا رہا ہوں کہ اگر آپ اس ملک کی بھلائی چاہتے ہیں تو آپ کو کیا کرنا چاہیے۔ مجھے توقع ہے کہ ہمارے ملک کے کارفرما کم از کم اب ان باتوں کی طرف سے بے توجہی نہ برتیں گے اور ہمارے نظامِ تعلیم و تربیت میں جس اصلاح کی سخت ضرورت ہے اس کے لیے عملاً کوئی قدم اٹھائیں گے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین